تدوینِ قرآن
یعنی
قرآن کے تحفظ پر ایک تاریخی نظر
افادات
حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی
ناشر
مکتبۂ اسحاقیہ جونا مارکیٹ کراچی ۲

تدوینِ قرآن
یعنی
قرآن کے تحفظ پر ایک تاریخی نظر
افادات
حضرت مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی
ناشر
مکتبہ اسحاقیہ جونا مارکیٹ کراچی ۲

تدوینِ قرآن

یعنی

قرآن کے تحفّظ پر ایک تاریخی نظر

افادات حضرت مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی

مرتّب و مؤلّف

جناب مولوی غلام ربّانی صاحب ایم، اے (عثمانیہ)

سنہ ۱۴۰۶ھ
۱۹۸۶ء

تعداد ـــــــــ
ناشر ـــــــــ مکتبہ اسحاقیہ جونا مارکیٹ کراچی
طباعت ـــــــــ اسحاقیہ پرنٹنگ پریس
زیر انتظام ـــــــــ عبدالخالق
قیمت ـــــــــ

ناشر
مکتبۂ اسحاقیہ
(۱) جونا مارکیٹ (پھول چوک) کراچی ۲
(۲) اردو بازار کراچی فون ۲۳۰۲۰۰

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	نمبر صفحہ
۱	تعارف	۵
۲	قرآن کا دوسری آسمانی کتابوں سے تعلق	۹
۳	قرآن، گزشتہ آسمانی کتابوں کا آخری اڈیشن ہے	۱۲
۴	کیا قرآن کسی کو اس کے آبائی وموروثی دین سے جدا کرتا ہے	۱۴
۵	قرآن کی تدوین کی مصدقہ شہادتیں	۱۶
۶	اندرونی شہادتیں	//
۷	ناقابلِ انکار تاریخی حقیقت	۲۳
۸	قرآن میں نوشت وخواند سے متعلق الفاظ	۲۷
۹	قرآن میں جاہلیت کے معنی	۲۸
۱۰	بیرونی شہادتیں	۳۰
۱۱	تشریحی روایات	۳۲
۱۲	عہد صدیقی میں قرآنی خدمت کی صحیح نوعیت	۵۳

۱۳	عہدِ عثمانی میں قرآنی خدمت کی نوعیت	۵۸
۱۴	لب و لہجہ کا اختلاف قبائل عرب و عربی و غیر عربی مسلمانوں میں	۵۹
۱۵	حضرت عثمانؓ کیا جامع القرآن تھے ؟	۶۴
۱۶	ایک بڑے فتنہ کا سدباب	۶۵
۱۷	مضحکات	۶۸
۱۸	مغالطات	۶۹
۱۹	حدیث رضاعت	۷۰
۲۰	رجم کی روایت	۷۳
۲۱	ایک ذیلی بحث اور خاتمہ	۸۶
۲۲	نزولی ترتیب کا ایک تاریخی لطیفہ	۹۳
۲۳	نزولی ترتیب پر قرآن کو مرتب کر کا نتیجہ کیا ہو گا ؟	۱۰۳

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تعارف

الحمد للہ وکفٰی والصلوٰۃ والسلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی

امابعد، وقت پڑنے سے پہلے بعض کتابوں کی صحیح قدروقیمت کا لوگوں کو اندازہ نہیں ہوتا، لیکن ضرورت جب پیش آجاتی ہے تو دنیا بڑی بے کسی کے ساتھ اس وقت ان کتابوں کو ڈھونڈھتی ہے۔

تقریباً کچھ یہی حال اِس "کتابچہ" یا مقالہ کا بھی ہے، پیغمبروں کے خاتم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جس حال میں بنی نوع انسانی کے آسمانی دستور اور الٰہی قانون کی آخری شکل یعنی قرآن مجید کو دنیا میں چھوڑ کر تشریف لے گئے، من وعن ہو بہو سرمو تفاوت کے بغیر "یہ خدائی صحیفہ" آج بھی دنیا میں موجود ہے خدا کا شکر ہے کہ مسلمانوں ہی کا یہ مسلمہ مسئلہ نہیں ہے بلکہ غیر اسلامی دائروں کی بھی یہ ایک جانی پہچانی، مانی ہوئی بات ہے، اسی لیے قرآنی آیات وسور کے جمع وترتیب کی سرگزشت کی تلاش کی عام طور پر ضرورت سمجھی نہیں جاتی، مگر خدانخواستہ بداندیشی سے کام لینے کی بدبختانہ جرأت اگر کبھی کی گئی تو مسلمانوں ہی کی کتابوں میں بعض ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں، جن سے بداندیشی کی اس مہم میں شاید ناجائز نفع اٹھاتے ہوئے

عوام کو مغالطوں کا شکار بنایا جا سکتا ہے۔

دل تو یہی چاہتا ہے کہ بداندیشی کا یہ جذبہ کبھی نہ اُبھرے لیکن شیطان نے اس سوال کو اگر چھیڑ دیا تو انشاء اللہ تعالیٰ اس وقت آپ کو ان چند اوراق میں وہ سب کچھ مل جائے گا جو شاید بڑے سے بڑے کتب خانوں کے کتابی ذخیروں میں بھی نہیں مل سکتا، اُسی وقت اس چھوٹی موٹی مختصر سی کتاب کی وقعت و قیمت کے صحیح اندازہ کا لوگوں کو موقع ملے گا اور وقت پر وہ تریاق انہی اوراق سے میسر آئے گا جو شاید اس کے سوا کہیں نہیں مل سکتا۔

تقریباً تیس چالیس سال کے مسلسل فکر و تامل، تلاش و جستجو کے آخری تحقیقی نتائج اس کتاب میں درج ہیں۔ جن لوگوں نے قرآن کے جمع و ترتیب کی متعلقہ روایتوں کا مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ کتنے فاحش اغلاط اور پیچ در پیچ ہمالیائی مغالطوں کے پہاڑوں کو کتنی آسانی کے ساتھ اُڑا دیا گیا ہے۔ شکوک و شبہات کے سارے بادل پھاڑ دیئے گئے ہیں اور ناجائز نفع اٹھانے والوں کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی گئی ہے۔

حق تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ خاکسار کے رفیق محترم مولوی غلام ربانی ایم اے (عثمانیہ) نے اس فقیر سراپا تقصیر کی جگر کاویوں اور دماغ سوزیوں کے ان نتائج کو بڑے پاکیزہ اسلوب اور دل نشین تعبیر میں اس کتاب کے اندر جمع کر دیا ہے۔ اگرچہ فقیر نے خود بھی اس عنوان پر مستقل کتاب لکھی ہے، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے میری کتاب کے

اس "جوہری خلاصہ" کے شایع ہوجانے کے بعد اب اصل کتاب کی اشاعت کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہی ہے، کیونکہ اس ضخیم و بسوط کتاب کے اکثر جوہری حقایق، اصولی مشتملات اس مختصر کتاب میں محفوظ ہوگئے ہیں، حق تعالیٰ مولوی غلام ربّانی کی اس محنت کا صلہ دین اور دنیا میں عطا کرے، اسلام پر نازک ترین وقت کا خطرہ سامنے آگیا ہے، دوسری چیزوں کے ساتھ مجھے امید ہے کہ اس نازک ترین گھڑی میں یہ مختصر رسالہ بھی انشاءاللہ کافی کارآمد ثابت ہوگا، کم ازکم اسلام کی اساسی کتاب جس پر اس دین کی بنیاد قائم ہے اس پر تو شک و شبہ کی گرد اچھالنے میں انشاءاللہ تعالےٰ اب کوئی بد اندیش کامیاب نہیں ہوسکتا۔ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِى السَّبِيْلَ ○

مناظر احسن گیلانی (گیلان) بہار
۱۵ ستمبر ۱۹۵۰ء

عرضِ ناشر

کتاب تدوینِ قرآن کافی عرصہ ہوا ہندوستان کے مشہور ادارہ ندوۃ المصنّفین نے پہلی مرتبہ شائع کی تھی، اپنی مقبولیت کی وجہ سے تھوڑے ہی عرصہ میں کتاب ہاتھوں ہاتھ نکل گئی، پاکستان میں اس کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی لیکن یہ کہیں بھی دستیاب نہ تھی۔ لہٰذا ہم نے علمی و دینی خدمت کے جذبہ سے چاہا کہ اس کتاب کو پاکستان میں شائع کیا جائے تاکہ اہلِ علم کی ضرورت پوری ہو، چنانچہ اس کے لئے ہم نے باقاعدہ سربراہِ ادارۂ مذکور حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب مدظلہم سے اس کی اجازت طلب کی جو حضرت موصوف نے بخوشی مرحمت فرمادی، ہم ان کی اس خصوصی عنایت پر تہہ دل سے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ہمیں اس مبارک کتاب کو شائع کرنے کی سعادت کا موقع دیا جزاھم اللہ خیرًا۔

تمنّا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہلِ علم حضرات کو اس سے فائدہ اٹھانے کی زیادہ سے زیادہ توفیق بخشے اور مصنّف رحمۃ اللہ علیہ کے اَجر میں روز افزوں اضافہ ہو!

ناظمِ مکتبہ
عبد الغنی ہاشم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایم۔اے تفسیر کے لیے امتحانی مقالہ خاکسار نے جو تیار کیا تھا یہ مضمون اسی مقالہ سے ماخوذ ہے علاوہ دوسری عام کتابوں کے علامہ جلال الدین سیوطی کی کتاب "اتقان" اور الجزائری کی "تبیان" سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ حضرت الاستاذ مولانا مناظر احسن گیلانی کے درسی محاضرات و امالی سے تحقیق کی راہ میں مجھے غیر معمولی مدد ملی ہے عموماً اس مضمون میں جتنے جدید اور نئے نقاط نظر ملیں گے کلّیۃً حضرت الاستاذ ہی کے اثر فیض وکرم کی تراوش ہی کے وہ نتائج ہیں۔ حضرت الاستاذ نے اس موضوع پر مستقل کتاب بھی لکھی ہے جو ابھی شائع نہیں ہوئی ہے۔ گویا خاکسار کا یہ مقالہ اسی مبسوط و ضخیم کتاب کا "جوہری خلاصہ" ہے جب تک آفتاب طلوع نہ ہو چاند ہی کی روشنی سے فائدہ اٹھائیے۔ (غلام ربانی)

قرآن کا دوسری آسمانی کتابوں سے تعلق تاریخی طور پر اس کا تعین کرنا دشوار کیا بلکہ ناممکن ہے کہ نسلِ انسانی کو پہلی کتاب خدا کی طرف سے کون سی کہاں اور کب ملی۔ قرآن کا اجمالی بیان یہ ہے کہ ہر امت میں نذیر اور خدا کے نمائندے آسمانی ہدایت کی تعلیم کے لیے آتے رہے اور جس طرح خاتم النبین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کی وحی ہوئی اسی طرح ان سے پہلے

نوح علیہ السلام اور ان کے بعد انبیاء علیہم السلام پر ہوتی رہی۔ ارشادِ باری ہے :۔

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ	ہم نے تم پر وحی اسی طرح کی جیسے
اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ	نوح پر اور نوح کے بعد پیغمبروں پر
مِنْۢ بَعْدِهٖ (مائدہ)	وحی کرتے رہے۔

اس سلسلے میں چند پیغمبروں کے نام لینے کے بعد

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ	ان پیغام لانیوالوں میں سے بعضوں
عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا	کاحال تم سے ہم نے بیان کیا اور
لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ۔	بعضوں کاحال نہیں بیان کیا ہے۔

بھی فرمایا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ انسانی زندگی کے نیک اور بد انجام کو علم وعمل کے نظام پر مرتب کرنے کے لیے اور اس کی تشریح و تعلیم کے لیے پیغمبروں کا سلسلہ ہمیشہ قائم رہا پھر دوسری جگہ اس کی بھی تصریح ہے کہ ؛

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ	الدین یعنی ایسا آئینی دستور جس پر زندگی کے
مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا	دوسرے دور میں بدلہ دیا جائے اسی کو قانون بناکر
وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ	جو تمہیں دیا گیا دیہ وہی دین ہے جس کی وصیت خدا
وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ	نے نوح کو کی، اور جس کی وحی ہم نے تم پر کی اور
وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ	اسی کی وصیت ہم نے ابراہیم کو کی اور موسیٰ کو بھی
اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا	اور عیسیٰ کو بھی (اسی کی وصیت کی گئی مقصد یہ تھا
تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (شوریٰ)	اور ہے) کہ اس الدین (اسی دستور کو) قائم

کرو اور اس میں بھروسہ۔

ایک اور مقام پر یہ فرما کر کہ

اَفَلَمْ یَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ	کیا بات کو وہ سوچ نہیں رہے ہیں۔ یا ان
اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ یَاْتِ	کے پاس کوئی ایسی چیز آئی ہے جو ان کے آباء
اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِیْنَ۔	اولین (اگلے باپ دادوں کو) نہیں دی
(المومنون)	گئی تھی۔

اس امر کو واضح الفاظ میں صاف کر دیا گیا کہ انسانی زندگی کا قدرتی دستورالعمل جس کی تعبیر دین و مذہب کیش اور دھرم وغیرہ الفاظ سے لوگ کرتے ہیں یہ انسانیت کا ایک مشترکہ موروثی ترکہ ہے اور اصولاً ایک ہی دستورالعمل ہے جس کی پابندی کا مطالبہ اس زمینی زندگی میں اول سے لے کر آخر تک بنی نوعِ انسانی کی تاریخ کے ہر دور میں کیا گیا اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا، آخر قانون کا بنانے والا جب ایک ہو اور جس کے لیے قانون بنایا گیا ہو وہ بھی ایک ہو تو شکل و صورت، چہرہ و بشرہ، رنگ و روغن کے اختلاف سے یا زمین کے کسی خاص خطہ میں سکونت کی وجہ سے جو کسی دریا پہاڑ وغیرہ سے گھرا ہو یا کسی خاص خاندان میں پیدا ہونے کی وجہ سے یا زبان کے اختلاف کی وجہ سے یا انسان جن چیزوں کو استعمال کرتا ہے ان کے بدل جانے کی وجہ سے کیا آدمی کی فطرت بدل جاتی ہے۔

بہرحال جیسا کہ مولانا گیلانی کا خیال ہے کہ زندگی کا وہی دستورِ کہن جو ہمارے آبا ر اولین کو ملا تھا۔ اصولاً اسی کا اعادہ، اسی کی تجدید کا عمل

پچھلی نسلوں میں بھی ہوتا رہا اسی لیے دین یا زندگی کا یہ دستورالعمل ہمارا ایک مشترک موروثی ترکہ ہے، البتہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قدرت کے عطا کیے ہوئے اس آئین کی حفاظت و نگرانی میں بوجوہ مختلف قومیں غفلتوں اور لاپرواہیوں کی شکار ہوتی رہیں۔ خدا کی خالص تعلیم سے ہٹ ہٹ کر اپنے ہی جیسے انسانوں کے خود تراشیدہ رسوم اور دستوروں میں لوگ اُلجھے رہے۔ مختلف زمانوں اور ملکوں میں زیادہ تر پیغمبروں کی ضرورت اسی عام تاریخی حادثہ نے پیدا کی یعنی جب خدا کی خاص تعلیم اور ہدایت نامہ سے لوگ ہٹ گئے تو پھر اُسی موروثی آئین کہن کی طرف واپس کرنے کے لیے حق تعالیٰ قوموں اور امتوں میں رسولوں اور پیغمبروں کو پیدا کرتا اور اٹھاتا رہا۔

چاہیے تو یہی تھا کہ مقنّن کی شخصی وحدت اور جن کے لیے قانون بنایا ان کی نوعی وحدت کی بنیاد پر لوگ اپنے اس موروثی قانون کو ایک ہی قانون کی حیثیت سے دیکھتے مگر تصدیق و توثیق، تصحیح اور تکمیل وغیرہ اغراض کے لیے متعدد پیغمبروں کا ظہور مختلف زمانوں میں جو ہوتا رہا یہ عجیب بات ہے کہ اسی ایک دستورالعمل کے پیش کرتے والوں کے اس تعدد و کثرت کو دیکھ کر غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ مذہب دنیا میں ایک نہیں بلکہ متعدد اور بہت سے ہیں۔

قرآن گزشتہ آسمانی کتابوں کا آخری ایڈیشن ہے

بقول حضرت الاستاذ ایک ہی کتاب کو چند آدمی اگر کتب خانہ سے نکالیں تو چند لانے والوں کی وجہ سے کیا وہی ایک کتاب بھی چند ہو جائے گی۔ یقیناً کسی مصنف کی کتاب کے چند اڈیشن کو دیکھ کر یہ فیصلہ کتنا غلط فیصلہ ہوگا کہ مصنف کی یہ ایک کتاب نہیں

بلکہ چند کتابیں بن گئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن تمام آسمانی کتابوں کے ساتھ اپنی اسی نسبت کا مدعی ہے یعنی پچھلی ساری آسمانی کتابوں کا اپنے آپ کو وہ آخری اور مکمل ترین اڈیشن قرار دیتا ہے اور قوموں کے پاس اس کتاب کے جو پرانے مشتبہ اور مشکوک یا ناقص و غیر مکمل نسخے رہ گئے ہیں ان کے متعلق اس کا صرف یہ مطالبہ ہے کہ اس جدید ترین اور کامل اڈیشن سے مقابلہ کرکے قومیں اپنی موروثی کتابوں کی تصحیح کرلیں، یہی اور صرف یہی ایک مطالبہ قرآن نے دنیا کی قوموں کے سامنے پیش کیا ہے، ظاہر ہے اس مطالبہ کا مطلب کسی حیثیت اور کسی لحاظ سے بھی یہ نہیں ہے کہ دنیا کی قوموں کے پاس آسمانی دین اور مذہب اپنے آباؤ اجداد سے جو پہنچا ہے اس دین سے اور اس دین کا انتساب جن بزرگوں کی طرف ہے ان بزرگوں سے بے تعلق ہو کر قرآن کو بالکلیہ ایک جدید دین اور دھرم کی کتاب کی حیثیت سے مانا جائے، یقیناً نہ قرآن ہی کا یہ مطالبہ ہے اور نہ قرآن کے ماننے والوں کی طرف سے یہ دعوت دنیا کے سامنے کبھی پیش ہوئی۔[۱]

---

[۱] اسی سے اندازہ کیجئے کہ عبداللہ بن سلام صحابی رضی اللہ عنہ جو علماء بنی اسرائیل میں سے تھے، جب رسول اللہ صلعم کے دست مبارک پر بیعت کی سعادت ان کو حاصل ہوئی تو انھوں نے عرض کیا کہ قرآن کے ساتھ تورات کی تلاوت بھی جاری رکھوں۔ آپ نے فرمایا "اقرا ہذا لیلۃ وہذا لیلۃ" (یعنی ایک رات قرآن پڑھا کرو اور ایک رات تورات) تذکرۃ حفاظ ذہبی ص ۲۶ ج ۱۔ طبقات ابن سعد میں بھی ابوالجلاء الجونی کے تذکرے میں لکھا ہے کہ سات دن میں قرآن اور چھ دن میں تورات ختم کرنے کا عام دستور اپنے لیے انھوں نے مقرر کرلیا تھا اور ختم کے دن لوگوں کو جمع کرتے تھے کہ اس دن رحمت نازل ہوتی ہے۔ ابن سعد ج ۷ ص ۱۶۱ (باقی صفحہ ۱۴ پر)

کیا قرآن کسی کو اس کے آبائی و موروثی دین سے جُدا کرتا ہے؟

آج کروڑہا کروڑ کی تعداد میں مسلمان دنیا کے اکثر علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں یقیناً ان میں عیسائی یہودی اور اسی قسم کی دوسری مذہبی امتوں کے لوگ بھی شریک ہیں۔ پھر کیا قرآن کو مان کر جو عیسائی تھے مسلمان ہونے کے بعد انھوں نے حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کی کتاب انجیل کی تکذیب کی، یا جو یہودی تھے مسلمان ہونے کے بعد

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳) اور واقعہ بھی یہی ہے کہ قرآن کی صحیح راہ نمائی میں اس قسم کی کتابوں کے پڑھنے سے جہاں تک میرا ذاتی تجربہ ہے خود قرآن کے سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے، انجیل و تورات خیر ان کا تو پوچھنا ہی کیا میں سنسکرت سے واقف نہیں ہوں لیکن اردو میں وید کے بعض حصوں کا ترجمہ ہو گیا ہے اس کا ایک دن مطالعہ کر رہا تھا جو یجر وید کا ایک ٹکڑا تھا ایک جگہ مجھے یہ فقرہ اس کتاب میں ملا" یعنی اے اگنی تو خوبصورت بچہ ہے، پودوں میں سے نکلا ہوا، تاریکی کو دور کرتا ہوا ماؤں سے شور کرتا ہوا پیدا ہوا ہے"۔ ادھیا ۱۲ کو کہتے ہوئے کچھ ڈر بھی معلوم ہوتا ہے لیکن جو واقعہ پیش آیا اس کا اظہار کرتا ہوں، اس اشلوک نے معاً میرے دماغ کو قرآن کی ان آیتوں کی طرف منتقل کر دیا جن میں ارشاد ہوا ہے کہ "تم دیکھتے ہو اس آگ کو جسے تم پیدا کرتے یا نکالتے ہو، کیا تم نے اس کے درخت کو اگایا، یا ہم ہیں اس کے اُگانے والے"۔ (الواقعہ) قریب قریب یہی مضمون سورۂ یٰسین میں بھی ہے۔ عام مفسرین عرب کے بعض خاص درختوں کا ذکر کر کے لکھ دیتے ہیں کہ ان کی شاخوں کو باہم رگڑ کر عرب آگ پیدا کیا کرتے تھے اسی کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن یجر وید کا یہ طرز تعبیر قرآن کے طرز تعبیر سے اس درجہ ملتا جلتا تھا کہ خیال گذرا کہ کیوں نہیں قرآن میں بھی "درخت" کو عام درخت سمجھا جائے اور جیسے وید میں ہے کہ آگ خوبصورت بچہ ہے پودوں سے نکلا ہوا یعنی آگ کا ظہور لکڑی ہی کے جلنے سے ہوتا ہے اور اسی سے شور کرتا ہوا پیدا ہوتا ہے، قرآن میں بھی کیا اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ۱۲۔ (مناظر احسن گیلانی)

موسیٰ علیہ السلام یا انبیاء بنی اسرائیل کی توہین کر رہے ہیں یا تورات اور تورات کے ساتھ دوسرے پیغمبروں کی جو کتابیں ہیں انہیں جھٹلا رہے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام کی تعلیم سے جو دور ہو گئے تھے قرآن شریف کو مان کر وہی عیسائی حضرت عیسیٰ اور ان کی صحیح تعلیم سے پھر قریب ہو گئے اور یہی حال ان ساری قوموں کے ساتھ پیش آیا ہے جو گزشتہ تیرہ ساڑھے تیرہ صدیوں میں قرآن کو مان کر اسلامی حلقہ میں داخل ہوتی رہی ہیں یعنی اپنے آبائی اور موروثی دین کے جن اجزاء وعناصر کو لوگ کھو بیٹھے تھے یا تاریخی حوادث وواقعات نے ان کے دین کے جن حقائق ومسائل کو مشتبہ ومشکوک بنا کر رکھ دیا تھا۔ قرآن شریف کی راہ سے ان کھوئی ہوئی چیزوں کو انہوں نے پا لیا اور شک وریب کی تاریکیوں میں جو باتیں رل مل گئی تھیں، قرآن کی روشنی میں اب یقین کی آنکھوں سے دیکھنے اور پا لینے میں وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ پس حقیقت یہی ہے کہ اپنے آباء اولین اور گزشتہ باپ دادوں کے دین سے قرآن پاک کو مان کر قطعاً کوئی الگ نہیں ہوا ہے بلکہ جو الگ ہوئے تھے بلاخوف تردید دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے آبائی دین ہی کی طرف خدا کی اس آخری کتاب نے ان سب کو واپس کر دیا ہے۔ اس نے توڑا نہیں ہے بلکہ جو ٹوٹے ہوئے تھے ان کو اپنے بزرگان سلف اور ان کی سچی تعلیم، صحیح زندگی کے ساتھ جوڑ دیا ہے، واقعہ یہی ہے خواہ دنیا اس کو مانے یہ نہ مانے قرآن کی دعوت و تبلیغ کا یہی محوری نصب العین ہے۔ بکھری ہوئی منتشر اور پراگندہ انسانیت کو اسی راہ سے وحدت ووفاق کے مرکزی نقطہ پر "وہ سمیٹ کر"

لے آنا چاہتا ہے۔

بہرحال یہ تو ایک تمہیدی ذیلی گفتگو تھی میں آپ کے سامنے اس موروثی دین کی الٰہی کتاب کے آخری ایڈیشن کے ان پہلوؤں کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جن کے متعلق بدبختی سے بد اندیش دماغوں میں خواہ مخواہ بعض بے بنیاد وساوس و اوہام مختلف راہوں سے گھس پڑے ہیں، یعنی قرآن مجید کی تدوین یا جمع و ترتیب کی جو واقعی سرگزشت ہے اسی کے متعلق ایک مختصر اجمالی بیان اُن لوگوں کے سامنے پیش کر رہا ہوں جو ناواقفیت کی وجہ سے ان ہی اوہام سے پیدا ہونے والی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں یا آئندہ مبتلا کئے جا سکتے ہیں۔

قرآن کی تدوین کی مصدقہ شہادتیں

قرآن کی تدوین یا جمع و ترتیب کے متعلقہ سوالوں پر جن شہادتوں سے روشنی پڑ سکتی ہے آسانی کے لئے ہم ان شہادتوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں، یعنی شہادتوں کا ایک سلسلہ تو وہ ہے جو خود اس کتاب کے اندر پایا جاتا ہے۔ ہم اندرونی شہادتوں سے اس کی تعبیر کر سکتے ہیں اور دوسرا سلسلہ ان تاریخی روایات کا ہے جن سے اس کتاب کے تدوینی حالات کے جاننے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے ہم ان کو بیرونی شہادتوں سے موسوم کریں گے۔ پہلے ہم اندرونی شہادتوں کو پیش کرتے ہیں۔

اندرونی شہادتیں

واقعہ یہ ہے کہ اس لحاظ سے دنیا کی ان تمام کتابوں میں جنہیں قومیں خدا کی طرف منسوب کرتی ہیں شاید قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے

جو اپنے متعلقہ سوالات کے جوابات کے لیے قطعاً خود مکتفی ہونے کی حیثیت رکھتی ہے، دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخی روایات کا جو ذخیرہ قرآن کے جمع و ترتیب کے متعلق پایا جاتا ہے اگر یہ ذخیرہ نہ بھی پایا جاتا جب بھی اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کے متعلقہ سوالات کے جوابوں کو ہم خود قرآن ہی میں پا سکتے ہیں۔

اس کتاب کا نازل کرنے والا کون ہے؟ کس پر نازل ہوئی؟ کس لیے نازل ہوئی؟ کیا صرف ان ہی بنیادی سوالوں کے جوابات جیسا کہ ہر قرآن پڑھنے والا جانتا ہے اس کتاب میں جگہ جگہ موجود نہیں ہیں! حالانکہ اسی نوعیت کی دوسری کتابوں میں اگر کوئی جاننا چاہے تو انصاف سے بتایا جائے کہ ان سوالوں کا جواب خود ان کتابوں میں کوئی کیا پا سکتا ہے؟ چونکہ قرآن کی یہ عام باتیں ہیں اس لیے ان سوالوں پر بحث کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے قرآن کی اندرونی شہادتوں کی روشنی میں اس وقت صرف حسب ذیل سوالوں کے جوابوں کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔

١۔ ابتدائی حالت اس کتاب کی کیا تھی بالفاظ دیگر میرا مطلب یہ ہے کہ جیسے عموماً خدا کی طرف منسوب ہونے والی دوسری کتابوں کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً زبانی یادداشتوں اور گیتوں اور بھجنوں کی شکل میں وہ رہیں اور صدیوں بعد وہ قلمبند ہوئیں[1]۔ اس باب میں قرآن کا کیا حال ہے؟

---

[1] حد یہ ہے کہ اس سلسلے میں کتابوں کے جس مجموعے کو دنیا کا قدیم ترین مجموعہ عموماً سمجھا جاتا ہے یعنی ہمارے ملک کی آکاش بانی وید کے متعلق آپ کو سن کر حیرت ہوگی (باقی صفحہ ۱۸ پر)

بقول مولانا گیلانی اس سوال کے حل کے لئے اوراق اُلٹنے کی بھی ضرورت نہیں بلکہ سورۂ فاتحہ کے بعد قرآن کی پہلی سورۂ بقرہ ہی کی پہلی آیت ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ (یہ ایک نوشتہ ہے جس میں شک نہیں ہے) اسی فقرہ میں اس سوال کا جواب آپ کو مل جائے گا یعنی خود کتاب کا لفظ جس کے معنی نوشتہ اور لکھی ہوئی چیز کے ہیں۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ پیش کرنے والا ابتداء ہی سے اس کو نوشتہ اور مکتوبہ شکل ہی میں پیش کرنا چاہتا ہے اور کتاب یا نوشتہ کا یہ لفظ کچھ اسی مقام پر استعمال نہیں ہوا ہے۔ قرآن پڑھیے، تقریباً ہر بڑی سورۃ میں کتاب یا نوشتہ ہونے کی اسی تعبیر کا مسلسل ذکر آپ کو ملتا چلا جائے گا، بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ کفار عرب کا یہ فقرہ جو قرآن میں نقل کیا گیا ہے یعنی وہ کہا کرتے تھے کہ:

اِكْتَتَبَهَا فَهِیَ تُمْلٰی عَلَیْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِیْلًا۔ (سورۂ فرقان) لکھ لیا ہے اس شخص نے (یعنی پیغمبر نے) اس کو (یعنی قرآن کو) پس وہی پڑھا جاتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ) کہ قرآن مجید جو اس سلسلے کی آخری کتاب ہے اس کے پانچ چھ سو سال بعد قلمبند ہوئی۔ البیرونی جو دسویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا تھا اس کا بیان ہے کہ اس کی آمد سے کچھ ہی دن پہلے ایک کشمیری پنڈت نے وید کو کتابی قالب عطا کیا ورنہ اس سے پہلے پشتہا پشت سے برہمنوں کا..... خاص طبقہ اس کو زبانی یاد کرتا چلا آرہا تھا۔ (دیکھو کتاب ہندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ کی معاشرت و اقتصادی حالت۔ از عبداللہ یوسف علی صفحہ ۱۷) ڈاکٹر گپتا نے اپنی کتاب ہندی فلسفہ میں لکھا ہے کہ عموماً ویدوں کے قلمبند کرنے کو زمانہ تک کفر سمجھا جاتا تھا۔ برہمن اپنے استادوں سے سُن کر زبانی یاد کر لیتے تھے اسی لیے اس کا نام سرتی تھا۔ دیکھو ہندی فلسفہ ج ۱ ص۱۶ مترجمہ دارالترجمہ حیدرآباد۔

اس پر صبح و شام

اس سے پہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی کتابت اور نوشتگی ایک عام اور پھیلی ہوئی بات تھی جسے وہ بھی جانتے تھے جنہوں نے اب تک اس کو خدا کی کتاب بھی نہیں مانا تھا۔

ماسوا اس کے اس کتاب یا نوشتے کے متعلق اس قسم کے ذیلی سوالات یعنی قرآن کس چیز پر لکھا جاتا تھا۔ پیغمبر تو خود اُمّی تھے لکھنے پڑھنے سے ناواقف تھے پھر کن لوگوں سے اس کو لکھواتے تھے آپ چاہیں تو ان سوالات کے جوابوں کو بھی قرآن ہی میں تلاش کر کے پا سکتے ہیں۔ مثلاً پہلا سوال یعنی قرآن کس چیز پر لکھا جاتا تھا۔ اس کے لئے قرآن ہی میں پڑھیئے :-

وَالطُّوْرِ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (الطور) — قسم ہے (کوہِ) طور کی اور لکھی ہوئی کتاب کی جو باریک جھلی کھلی ہوئی پر لکھی ہوئی ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے رَقّ ایک خاص قسم کی باریک جھلی کو کہتے ہیں جو لکھنے کے کام کے لیے تیار کی جاتی تھی انگریزی میں جسے پارچمنٹ 'PARCHMENT' کہتے ہیں اور قدیم زمانہ کی تورات، انجیل وغیرہ جیسی کتابیں اسی پر لکھی ہوئی اب بھی ملتی ہیں۔ قرآن یہ اطلاع دیتا ہے کہ اس کی کتابت بھی رَق ہی پر ہے۔ اسی طرح اس کی خبر دیتے ہوئے کہ قرآن تو چونک پیدا کرنے والی ایک چیز ہے اسی کی صفت میں فرمایا گیا ہے کہ :-

---

[۱] تفسیر فتح البیان ج ۹ ص ۲۸ میں دیکھئے: کتاب مسطور جو رق منشور میں لکھی ہوئی ہے اس سے مراد قرآن ہے ۱۲ -

فِیْ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ ۔ صحیفوں میں لکھا ہوا ہے ایسے صحیفے جو مکرم
مَّرْفُوْعَۃٍ مُّطَہَّرَۃٍ ۔ ومحترم ہیں پاک ہیں لکھے ہوئے ہیں۔
بِاَیْدِیْ سَفَرَۃٍ کِرَامٍ ۔ ہاتھوں سے ان لکھنے والوں کے جو بڑے
بَرَرَۃٍ ۔ (عبس) بزرگ اور پاکباز لوگ ہیں۔

جس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوا کہ قرآن صحیفوں میں لکھا جا رہا تھا بلکہ اس کے لکھنے والوں کی ان اعلیٰ خصوصیات کا بھی اظہار کیا گیا ہے جن میں صحت نویسی کی ضمانت پوشیدہ ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ قرآن کے پڑھنے والے اس قسم کی آیتیں پڑھتے ہیں مثلاً،

لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَہَّرُوْنَ ۔ نہیں چھوئیں اس کو (یعنی قرآن کو)
(الواقعہ) مگر وہی لوگ جو پاک ہوں۔

مگر نہیں سوچتے کہ زبانی یا دداشت کی شکل میں جو چیز ہوگی کسی حیثیت سے بھی، یہ حکم یعنی مس اور چھونے کی ممانعت کا تصور اس کے متعلق کیا جا سکتا جس کے صاف معنی یہی ہیں کہ خود قرآن نے اپنے آپ کو ایک ایسی نوشتہ اور مکتوبہ شکل میں پیش کیا ہے جس کے مس اور چھوئے جانے کا بھی امکان تھا ورنہ ممانعت یقیناً ایک بے معنی سی بات ہو جاتی ہے۔

علاوہ اس کے تدریجی نزول یعنی وقفہ وقفہ سے قرآنی آیتیں جو اتری تھیں اور "جملۃ واحدۃ" یعنی ایک ہی دفعہ ان کو نازل نہیں کیا گیا اس کی وجہ جو بیان کی گئی ہے کہ :-

لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ — تاکہ ہم جمائیں اس کے ساتھ تیرے دل کو

ظاہر ہے کہ قرآن کو دل میں جمانے یعنی یاد کرلے میں خود پیغمبر کو نزول کے اسی تدریجی طریقہ سے بہ سہولت موقعہ مل سکتا تھا۔ پھر سورۂ بنی اسرائیل میں،

قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ — قرآن (جس کی آیتوں کو) جدا جدا کر کے
عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ ۔ — ہم نے اتارا (یہ اس لئے کیا گیا) تاکہ لوگوں
(بنی اسرائیل) — پر وقفہ کے ساتھ اس کتاب کو تم پڑھو۔

اس تدریجی نزول کی وجہ تھی جو بیان کی گئی کہ لوگوں کے سامنے وقفہ وقفہ سے پڑھنے کا موقع اسی طرح مل سکتا ہے گویا علاوہ پیغمبر کے دوسرے لوگوں کو بھی قرآن شریف کے زبانی یاد کرانے کی بھی تدبیر ہو سکتی تھی اس تدبیر میں جو کامیابی ہوئی اس کی خبر دیتے ہوئے قرآن ہی میں یہ اعلان کیا گیا ہے۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ — بلکہ وہ (یعنی قرآن) تو کھلی ہوئی واضح
فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا — آیتوں کا (مجموعہ ہے) جو ان لوگوں کے
الْعِلْمَ (عنکبوت) — سینوں میں ہے جنہیں علم دیا گیا ہے۔

مطلب یہی ہوا کہ علاوہ کتابی قالب میں محفوظ ہونے کے صحابیوں میں اہل علم کا جو طبقہ تھا قرآن اطلاع دیتا ہے کہ ان کے سینوں میں بھی وہ محفوظ ہوتا چلا جا رہا تھا نیز سورۂ مزمل کے آخری رکوع میں۔

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ — پس پڑھو تم لوگ جتنا آسانی سے
مِنَ الْقُرْاٰنِ ۔ — ہوسکے قرآن کو۔

کے حکم کو نافذ کرتے ہوئے اس واقعہ کا تذکرہ قرآن ہی میں کیا گیا ہے کہ پیغمبر

ہی نہیں بلکہ پیغمبر کے صحابیوں کا ایک طائفہ اور گروہ بھی۔

اَدْنٰی مِنْ ثُلُثَیِ الَّیْلِ وَ نِصْفَهٗ وَ ثُلُثَهٗ۔ رات کے دو تہائی یا آدھے یا دو تہائی حصہ میں۔

کھڑے ہوتے ہیں اور قرآن کو دہراتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے متعلق

یَتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰهِ بِالَّیْلِ وَ النَّهَارِ۔ پڑھتے ہیں اللہ کی آیتوں کو رات میں بھی اور دن میں بھی۔

وغیرہ آیتوں میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ صبح و شام ان کا مشغلہ اپنے یاد کیے ہوئے قرآن کا اعادہ اور تکرار تھا۔

قرآن کی ان اندرونی شہادتوں کے بعد کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس کتاب کی حفاظت کا سامان کتابۃً و حفظاً یعنی لکھ کر اور زبانی یاد کر کے جو کیا گیا تھا اس کے لئے کسی بیرونی شہادت کی ضرورت ہے۔ خود قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت خود اس کتاب کے محفوظ کرنے کا سامان اس حد تک کر چکی تھی کہ دوسری آسمانی کتابوں کے ساتھ مختلف حوادث و واقعات جو پیش آتے رہے ان کا قطعی طور پر شروع ہی انسداد کر دیا گیا تھا۔

سورۃ البروج میں ہے :- 27582

هَلْ اَتٰكَ حَدِیْثُ الْجُنُوْدِ فِرْعَوْنَ وَ ثَمُوْدَ کیا تمہارے پاس جتھوں کی خبر پہنچی ہے یعنی فرعون اور ثمود کے جتھوں کی۔

اس سوالیہ فقرے کے بعد قرآن ہی میں اس دعوے کا اعلان کیا گیا ہے

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ فِیْ بلکہ وہ تو بلند و بالا قرآن ہے

لَوۡحٍ مَّحۡفُوۡظٍ لوح محفوظ میں۔

بقول مولانا گیلانی اس کا بظاہر یہی مطلب ہوتا ہے کہ فرعون و ثمود جیسی قوموں کی سی جبار حکومتوں کی طاقت بھی قرآن کو غیر محفوظ کرنے کی کوشش کسی زمانہ میں بھی خدانخواستہ اگر کرے گی تو ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا تیرہ سو سال سے قرآن کے اس دعوے کی جو دوست نہیں ہیں، وہ بھی تصدیق کر رہے ہیں:۔

"ہم قرآن کو محمد کا کلام اسی طرح یقین کرتے ہیں جس طرح مسلمان اس کو خدا کا کلام یقین کرتے ہیں۔" (اعجاز التنزیل ص ۵۰۰)

یہ ایک غیر مذہب کے آدمی وان ہیم (جرمنی) کا ایسا منصفانہ اعتراف ہے کہ قرآن کی تاریخ سے تھوڑی بہت بھی واقفیت رکھتا ہے خدا کا کلام اس کو نہ بھی مانے لیکن وان ہیم نے جو بات کہی ہے اس کے اعتراف و اقرار پر تو اپنے آپ کو وہ بہرحال مجبور پائے گا۔

ناقابلِ انکار تاریخی حقیقت

واقعہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کتاب کو جن خصوصیتوں کے ساتھ دنیا کے حوالے کیا تھا ابتدا سے اس وقت تک بغیر ادنیٰ تغیر و تبدل اور سر مو تفاوت کے وہ اسی طرح نسلاً بعد نسلٍ کروڑہا کروڑ مسلمانوں میں اس طریقہ سے منتقل ہوتی ہوئی چلی آرہی ہے کہ سال دو سال تو خیر بڑی بات ہے ایک لمحہ کے لئے بھی نہ قرآن ہی مسلمانوں سے کبھی جدا ہوا اور نہ مسلمان قرآن سے جدا ہوئے اور اب تو طباعت واشاعت وغیرہ کے لامحدود ذرائع کی پیدائش

کا نتیجہ یہ ہو چکا ہے کہ میر و سودا کی غزلوں یا اسی قسم کی دوسری معمولی چیزوں کو کوئی اب دنیا سے مٹا نہیں سکتا تو قرآن کے مٹنے مٹانے کا بھلا اب امکان ہی کیا باقی رہا؟

اس وقت تک میں نے قرآن کی انہی اندرونی شہادتوں کا ذکر کیا ہے جن کے نتائج اور مفاد کو وہ بھی مانتے ہیں اور ان کو ماننا ہی چاہیے جنہوں نے اب تک اس کتاب کو خدا کی کتاب تسلیم نہیں کیا ہے۔ باقی قرآن جن کے نزدیک خدا کی کتاب ہے ان کے لئے تو اس سلسلہ میں بقول مولانا گیلانی[1] خود قرآن ہی نے کسی قسم کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ (حم سجدہ) — قرآن میں نہ سامنے سے الباطل کے گھسنے کی گنجائش ہے اور نہ پیچھے سے

اس کا حاصل یہی تو ہے کہ الباطل (یعنی قرآن کا جو جز نہیں ہے) اس کے لئے خدا نے ذمہ داری لی ہے کہ چاہنے والے کسی راستہ بھی چاہیں کہ قرآن میں اس کو داخل کر دیں تو وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے کہ ان الفاظ کو خدا کے الفاظ جو تسلیم کر چکا ہے کیا وہ اپنے آپ کو مسلمان باقی رکھ سکتا ہے اگر کسی لفظ یا شوشہ تک کے اضافہ کا قرآن میں وہ تصور کرے؟

اور جو حال اضافہ کا ہے بجنسہٖ یہی کیفیت کمی کی بھی ہے۔ مولانا گیلانی نے اس سلسلہ میں سورۃ القیامۃ کی آیت اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ

---

[1] قرآن میں بیشی اور کمی یا اضافہ ونقص کے عدم امکان کے اس مسئلہ کا استنباط قرآنی آیتوں ہی سے مولانا گیلانی نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے اور یہ مضمون اسی سے ماخوذ ہے۔

عَلَيْنَا بَيَانَهٗ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اگرچہ نئے مگر بالکل صحیح نتائج پیدا کئے ہیں، مولانا کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کا اتارنے والا خدائے ذوالجلال جب خود فرماتا ہے:۔

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ (القیامہ) — قطعاً ہم پر قرآن کے جمع رکھنے کی ذمہ داری ہے۔

تو اس کی صورت ہی کیا باقی رہتی ہے کہ قرآن میں جن چیزوں کو خدا جمع کر چکا ہے ان کو قرآن سے کوئی نکال دے یا اپنی جگہ سے ہٹا دے بلکہ اسی کے بعد اگر غور کیا جائے تو قُرْاٰنَهٗ کے لفظ کا اضافہ جَمْعَهٗ کے بعد بلاوجہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ سمجھا جائے تو نظر آئے گا کہ بعض پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کے ازالہ کا اس میں سامان مل سکتا ہے، سوال ہو سکتا تھا کہ صرف جمع کرنے اور باقی رکھنے کی ذمہ داری اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ کے الفاظ سے لی گئی ہے جس کا مفاد یہی ہو سکتا ہے کہ قرآن کے کسی جزو کو خدا غائب نہ ہونے دے گا اور قرآن دنیا میں اپنے تمام اجزا کے ساتھ رہتی دنیا تک موجود رہے گا۔ لیکن اسی دنیا میں بیسیوں کتابیں ایسی ہیں جن کا پڑھنے والا اب کوئی باقی نہیں رہا، ایسی صورت میں کتاب کا دنیا میں رہنا نہ رہنا دونوں باتیں برابر ہیں۔ اب اگر سوچئے تو اس خطرہ کا جواب "قُرْاٰنَهٗ" کے لفظ میں آپ پا سکتے ہیں یعنی اس کی بھی ذمہ داری "قُرْاٰنَهٗ" کے لفظ سے لی گئی کہ قیامت تک اس کتاب کے پڑھنے والوں کو خدا پیدا کرتا رہے گا۔ اور اس وقت تک یہ ذمہ داری جیسا کہ دنیا

دیکھ رہی ہے خدا پوری کر رہا ہے، آخر اس "قُرْآنَهُ" کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ جیسے قرآنی اجزاء کے جمع رکھنے کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے لی ہے اسی طرح اس کتاب کے پڑھنے پڑھانے کا ذمہ ار بھی وہ خود ہی ہے۔ آگے سوال ہو سکتا تھا کہ پڑھنے والے بھی باقی رہیں لیکن سمجھنے اور سمجھانے والے غائب ہو جائیں تو اس وقت بھی کتاب کا افادہ ختم ہو جائے گا جیسے آج مثلاً وید کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ اس کی زبان اتنی پرانی ہو چکی ہے کہ لغت کی مدد سے بھی اس کا سمجھنا مشکل ہے۔[1]

اسی وسوسہ کی ضمانت

ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ‏ پھر ہم ہی پر ہے اس کا بیان بھی۔

کے الفاظ میں آپ پا سکتے ہیں۔ آخر جس کتاب کے معانی و مطالب کے بیان و تشریح کی ذمہ داری اس خدا نے لی ہو جس کا وجود ماضی و حال و مستقبل سب سے مساوی تعلق رکھتا ہے تو کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ اپنی اس ذمہ داری کو تاریخ کے ہر دور میں کیوں پوری نہ فرمائے گا؛ قرآن سے یہی سمجھ میں بھی آتا ہے۔ اور یہی دیکھا بھی جا رہا ہے کہ ہر زمانہ کے اقتضاء کے مطابق قرآنی معانی و مطالب کی تشریح و تعبیر کرنے والے مسلسل چلے

---

[1] پنڈت سندر لال جی اپنی مشہور کتاب گیتا اور قرآن میں وید کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ان کی (یعنی ویدوں کی) زبان اتنی پرانی اور عجیب ہے اور ایک ایک منتر کے اتنے اتنے ارتھ لگائے جا سکتے ہیں کہ بے پڑھے لوگوں کے لئے نہیں بلکہ ودوانوں (علماء) کے لئے بھی ہزاروں برس سے وید ایک پہیلی رہا ہے اور ہمیشہ پہیلی ہی رہے گا (ص ۹۹ کتاب مذکور کا اردو ایڈیشن)

آرہے ہیں۔ دراصل انہی تفصیلات کا اجمالاً ذکر قرآن کی مشہور آیت میں فرمایا گیا ہے جسے عموماً مولوی اپنے وعظوں میں لوگوں کو سناتے ہی رہتے ہیں۔ یعنی:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ (الحجر)	ہم ہی نے اس ذکر (چونک پیدا کرنیوالی کتاب) کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی قطعاً حفاظت کرنیوالے ہیں

بہرحال بیرونی شہادتوں سے اگر قطع نظر بھی کر لیا جائے تو قرآن کی اندرونی شہادتوں ہی سے ان سارے سوالوں کے جوابوں کو ہم حاصل کر سکتے ہیں جو قرآن جیسی کسی کتاب کے متعلق دلوں میں پیدا ہو سکتے ہیں۔

قرآن میں نوشت و خواند سے متعلق الفاظ

انتہا یہ ہے کہ قرآن کے عہد نزول میں عرب کے ماحول کی جو نوعیت نوشت و خواند کے لحاظ سے تھی عرب کی صحیح تاریخ کا جنہوں نے مطالعہ نہیں کیا ہے نیز قرآن ہی کی ایک اصطلاح یعنی لفظ "جاہلیت" کے اصطلاحی معنی سے واقف ہونے کی وجہ سے بعض لوگ اس مغالطہ میں جو مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جاہلیت کے اس دور میں قرآن کی کتابت کے امکان کی صورت ہی کیا تھی؟ انہوں نے باور کر لیا ہے کہ عرب میں نہ لکھنے والے پائے جاتے تھے اور نہ لکھنے پڑھنے کا سامان اس وقت اس ملک میں موجود تھا، مگر کاش معترضین کا یہ گروہ صرف قرآن ہی کا مطالعہ کر لیتا تو اس کتاب میں بار بار رقّ، قرطاس، صحیفہ صحف[1]، قلم، زُبر،

---

[1] رق، قرطاس، صحیفہ، صحف، ان چاروں الفاظ سے وہ (باقی صفحہ ۲۸ پر)

الواح، مداد، (روشنائی) اسفار، کتب وغیرہ، الغرض ایسی ساری چیزیں جن کا عموماً نوشت وخواند سے تعلق ہے۔

" ان کے ذکر سے قرآن آپ کو لبریز نظر آئے گا۔ اور یہ تو لکھنے پڑھنے کے سامان کا حال ہے، باقی رہا لکھنے والے، سو حیرت ہوتی ہے کہ عرب کے اُس زمانے کے باشندوں کی طرف قرآن ہی یں

يَكْتُبُونَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ	لکھتے ہیں وہ لوگ کتاب اپنے ہاتھوں
ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ	سے اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کے پاس سے
عِنْدِ اللّٰهِ (۴ البقرہ)	آئی ہوئی کتاب ہے۔

پڑھتے ہیں پھر لین دین کے جس قانون کا طویل بیان سورۂ بقرہ کے آخر میں پایا جاتا ہے اور تاکید کے ساتھ قرضی معاملات کے لکھنے کا اصرار قرآن نے جو کیا ہے سوچنا چاہیے کہ ان امور کا انتساب ان لوگوں کی طرف کسی حیثیت سے بھی صحیح ہو سکتا ہے جو نوشت وخواند سے قطعاً بیگانہ اور ناآشنا ہوں"۔

قرآن میں جاہلیت کے معنی رہا جاہلیت کا لفظ سو میں بیان کر چکا ہوں کہ یہ قرآن کی بنائی ہوئی اصطلاح ہے، متعدد مقامات پر اس نے اپنی اس اصطلاح کو استعمال کیا ہے۔ مثلاً مردوں اور عورتوں کی مخلوط سوسائٹی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ	اور نہ بناؤ سنگار کرو جاہلیت اولیٰ

(باقی صفحہ ۲۷) اوراق سمجھ میں آتے ہیں جن پر ایام جاہلیت میں لوگ لکھتے تھے، جو جھلی یا باریک کھالوں سے بنائے جاتے تھے، ۱۲

اَلۡاُوۡلٰی۔ (الاحزاب)   والوں کے بناؤ سنگار کی طرح۔

یا عرب پر "نسلی و لسانی" اور وطنی حمیتوں کا جو بھوت سوار تھا[1]۔ اس کی تعبیر حَمِیَّۃَ الۡجَاھِلِیَّۃِ سے کی گئی ہے یا خدا کے متعلق ارتیابی (ایگناسٹک) ذہنیت عام عربوں پر جو مسلط تھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے،

یَظُنُّوۡنَ بِاللّٰہِ غَیۡرَ الۡحَقِّ   اور خیال رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ

ظَنَّ الۡجَاھِلِیَّۃِ (آل عمران)   جاہلیت کے خیالات۔

فرمایا گیا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ کسی جگہ پر بھی "جاہلیت" کے اس لفظ سے وہ مطلب سمجھا جاتا ہے جو اس زمانے کے جاہلوں اور ناواقفوں نے سمجھ رکھا ہے

---

[1] اسی سلسلہ کا مشہور لطیفہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو عرب کے مضری قبیلہ سے نسلی تعلق رکھتے تھے جب آپ کے مقابلہ میں مضری قبیلہ کے دوسرے حریف عربی قبیلہ ربیعہ کے ایک آدمی مسیلمہ نے بھی نبوت کے دعوے کا اعلان کر دیا تو لکھا ہے کہ طلحۃ النمری قبیلہ ربیعہ کا ایک سردار مسیلمہ کے پاس آیا۔ گفتگو کے بعد طلحہ نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو (مسیلمہ) جھوٹا ہے، اور محمدؐ سچے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ طلحہ نے کہا کہ ربیعہ کا کذاب (جھوٹا) مضر کے صادق (راستباز) سے مجھے زیادہ محبوب ہے، اس کے بعد مسیلمہ کے رفقاء میں شریک ہو گیا (ص۲۴۶ طبری ج ۳) مسیلمہ کے دعوے کی بنیاد قومی حمیت و عصبیت پر مبنی تھی۔ اس کا پتہ ان فقروں سے بھی چلتا ہے جو قرآن کے مقابلہ میں شریر بنایا کرتا تھا حضرت ابوبکر کے سامنے سنانے والے نے سنایا تھا کہ مسیلمہ یہ بھی کہتا تھا۔ یا ضفدع نقی نقی لا الشارب تمنعین ولا الماء تکدرین لنا نصف الارض ولقریش نصف الارض ولکن قریشا قوم یعتدون۔ (اے مینڈک کی ٹرٹر تو نہ پانی (باقی صفحہ ۳۰ پر)

واقعہ یہ ہے کہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کے مقابلہ میں عربوں کی غیر اسلامی زندگی اخلاقاً و اعتقاداً جو کچھ بھی تھی اور جن خصوصیتوں کی حامل تھی دراصل اسی کی تعبیر قرآن جاہلیت سے کرتا ہے بہر حال یہ بات کہ اسلام سے پہلے نوشت و خواند سے عرب کے لوگ چونکہ ناواقف تھے اس لئے ان کے زمانہ کو قرآن جاہلیت کا زمانہ قرار دیتا ہے، یہ وہی کہہ سکتا ہے جو قرآن سے بھی جاہل ہے اور ایام جاہلیت کی تاریخ سے بھی۔

بیرونی شہادتیں | قرآن کی ان اندرونی شہادتوں کے اجمالی بقدر ضرورت تذکرہ کے بعد اب میں بیرونی شہادتوں کی طرف پڑھنے والوں کی توجہ منعطف کرانا چاہتا ہوں۔ اس موقع پر سب سے پہلے شیعی فاضل علامہ طبرسی کے خیالات کا پیش کرنا مناسب ہوگا انہوں نے اپنی تفسیر "مجمع البیان" میں لکھا ہے اور بالکل صحیح لکھا ہے۔

اِنَّ الْعِلْمَ بِصِحَّةِ نَقْلِ الْقُرْاٰنِ كَالْعِلْمِ بِالْبُلْدَانِ وَالْحَوَادِثِ الْكِبَارِ وَالوقائع العظام وَالْكِتَابِ الْمَشْهُوْرَةِ

یعنی قرآن اپنی اصلی حالت کے ساتھ گزشتہ نسلوں سے منتقل ہوتے ہوئے پچھلی نسلوں تک پہنچا ہے اس واقعہ کے علم کی نوعیت وہی ہے جو بڑے بڑے شہروں یا مشہور حوادث اور اہم تاریخی واقعات یا مشہور کتابوں کے علم کی ہے۔

(مقدمہ روح المعانی ص۲۳)

(بقیہ صفحہ ۲۹) پینے والوں کو روکتی ہے اور نہ پانی کو گدلا کرتی ہے، زمین عرب کی آدھی ہماری یعنی ربیعہ والوں کی اور آدھی قریش کی مگر قریش تو زیادتی سے کام لے رہے ہیں

(ص ۲۵۳ ج ۳ طبری)

بلاشبہ واقعہ یہی ہے، آج نیویارک اور لندن کے وجود میں شبہ یا شک جیسے جنون ہے یا جنگ عظیم کے حادثہ کا منکر پاگل سمجھا جائے گا۔ یقیناً متواتر اور متوارث ہونے میں بجنسہٖ یہی حال قرآن مجید کا بھی ہے، یہ ایک واقعہ ہے کہ تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال کی اس طویل مدت میں ایک لمحہ کے لئے نہ مسلمان ہی اس کتاب سے جدا ہوئے اور نہ یہ کتاب ہی مسلمانوں سے جدا ہوئی جسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سپرد کرکے دنیا سے تشریف لے گئے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جن مسلمانوں کے سپرد اس کتاب کو کیا تھا، ان کی تعداد لاکھوں سے متجاوز تھی پھر ان ہی لوگوں نے اپنی بعد کی نسل تک اسے پہنچایا جن کی تعداد بلا مبالغہ کروڑوں سے بھی آگے بڑھ چکی تھی اور یوں ہی طبقۃً بعد طبقۃٍ نسلاً بعد نسلٍ نوشتہ و مکتوبہ شکل میں یہ کتاب مسلمانوں میں منتقل ہوتی چلی آرہی ہے پس سچی بات یہی ہے کہ قرآن تو قرآن ایسی کتابیں جیسے نحو میں سیبویہ کی یا اصول میں المزنی کی کتاب ہے بقول علامہ طبرسی:

لَوْاِنَّ مُدْخِلاً اَدْخَلَ	اگر سیبویہ اور المزنی کی کتابوں میں
فِیْ کِتَابِ سِیْبَوَیْہِ وَالْمُزَنِیْ	کوئی شخص اپنی طرف سے کسی چیز کو
بَابًا مِنَ النَّحْوِ لَیْسَ مِنَ الْکِتَابِ	داخل کردے تو فوراً یہ بات پہچان
لَعُرِفَ (روح ص۲۳)	لی جائے گی۔

تو پھر قرآن میں اضافہ یا کمی کے امکان کی بھلا کیا صورت ہے اسلامی ممالک کے کسی ابتدائی مکتب کا ایک بچہ بھی اس شخص کو ٹوک سکتا ہے جو فتحہ

(زبر) کی جگہ کسی حرف کو رفع (پیش) کے ساتھ پڑھے گا جس کا جی چاہے اس کا تجربہ ہر جگہ کر سکتا ہے۔

تواتر اور توارث کے اس عام قصہ کے سوا قرآن کے جمع و ترتیب کے سلسلہ میں بیرونی روایتوں کا جو ذخیرہ پایا جاتا ہے میرے نزدیک ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حصہ تو ان روایتوں یا شہادتوں کا ہے جن سے قرآن کے بعض اجمالی بیانات یا شہادتوں کی شرح ہوتی ہے۔ ہم پہلے انہی کا ذکر کرتے ہیں۔

تشریحی روایات — مطلب یہ ہے کہ قرآنی آیات کا نزول وقفہ وقفہ سے تدریجاً جو ہوتا رہا آپ سن چکے ہیں کہ یہ خود قرآن کا دعویٰ ہے اور ایک سے زائد مقام پر اس دعوے کا ذکر خود قرآن ہی میں کیا گیا ہے، اس دعوے کی تفصیل روایتوں میں یہ ملتی ہے کہ قرآن کی ایک سو چودہ سورتوں کی حیثیت دراصل مستقل کتابوں یا رسالوں کی قرار دی گئی تھی، مثالاً اس کو یوں سمجھیے کہ تاریخ، فلسفہ، اقلیدس، طب اور جغرافیہ وغیرہ مختلف علوم و فنون کی کتابوں کو ایک ہی مصنف اگر تصنیف کرنا شروع کرے اور تصنیف میں یہ طریقہ اختیار کرے کہ جس کتاب کا جو مواد فراہم ہوتا جائے اس کو متعلقہ کتاب میں درج کرتا چلا جائے اور یوں آہستہ آہستہ دس بیس برس میں آگے پیچھے اس کی یہ ساری تصنیفیں ختم ہوں، واقعہ یہ ہے کہ کچھ یہی کیفیت قرآنی سورتوں یا ان مستقل رسالوں کی ہے[1]۔ جن کے

(لہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

مجموعہ کو ہم قرآن کہتے ہیں۔ بتدریج تیئیس سال میں ان سب کے نزول کا سلسلہ ختم ہوا۔ ان سورتوں میں کوئی سورۃ اختتام تک پہلے پہنچی، اور کوئی بعد۔ یہی مطلب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ کا ہے جو ابو داؤد، نسائی اور ترمذی وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر متعدد
عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَنْزِلُ عَلَیْہِ	سورتیں اترتی رہتی تھیں (یعنی ایک ہی
السُّوَرُ ذَوَاتُ الْعَدَدِ	زمانہ میں مختلف سورتوں کے نزول کا
(مختصر کنز العمال برحاشیہ مسند احمد ج ۲ ص ۴۶)	سلسلہ جاری رہتا تھا

اسی روایت میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ ذوات العدد (متعدد) سورتیں تدریجی طور پر جو نازل ہو رہی تھیں ان کے لکھوانے اور قلم بند کرانے کا طریقہ یہ تھا۔

۱۔ قرآن ہی میں ایک جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف کرتے ہوئے یہ جو فرمایا گیا ہے رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِیْهَا كُتُبٌ قَیِّمَةٌ ۔ اللہ کی طرف سے پیام لاتے ہیں پڑھتے ہیں پاک صحیفوں کو جن میں استوار اور مضبوط لازوال (تعلیم والی) کتابیں ہیں۔ اس میں "کتب" کے لفظ کو "کتاب" کی جمع قرار دینا قطعاً لغت کی خلاف ورزی نہیں ہے اور مراد ان سے قرآن کی بھی متعدد کتابیں یا رسالے ہوں جنہیں ہم اصطلاحاً قرآن کی سورتیں کہتے ہیں تو انکار کی کیا کوئی معقول وجہ ہو سکتی ہے؟ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ صحف میں کتابوں کے ہونے کی ترکیب میں لوگوں نے جو دشواریاں پیدا کرکے طرح طرح کی دور از کار تاویلیں کی ہیں ان کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی صرف سیدھا ترجمہ یہ ہو جاتا ہے کہ پاک اوراق جن میں استوار اور مستحکم کتابیں یعنی سورتیں لکھی ہوئی ہیں ۱۲ (مناظر احسن گیلانی)

فَکَانَ اِذَا اُنْزِلَ عَلَیْہِ الشَّیْئُ دَعَا بَعْضَ مَنْ کَانَ یَکْتُبُ فَیَقُوْلُ ضَعُوْا ھٰذَا فِی السُّوْرَۃِ الَّتِیْ یُذْکَرُ فِیْھَا کَذَا وَکَذَا (مختصر کنز صفحہ ۴۸)

جب رسول اللہؐ پر کوئی چیز نازل ہوتی تو جو لکھنا جانتے تھے ان میں سے کسی کو آپ طلب فرماتے اور کہتے کہ اس آیت کو اس سورۃ میں لکھو جس میں فلاں باتیں یا آیتیں ہیں۔[1]

مطلب وہی کہ طب کے متعلقہ مضامین کو طب کی کتاب میں اور تاریخ کے مواد کو تاریخ کی کتاب میں مذکورہ بالا طریقۂ تصنیف اختیار کرنے والا مصنف جیسے داخل کرتا چلا جاتا ہے اسی طرح قرآنی آیات کو ان کی متعلقہ سورتوں میں آنحضرت صلعم شریک کرنے کا حکم دیا کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم جبریل علیہ السلام دیتے تھے۔

جیسا کہ معلوم ہے خود قرآن ہی نے

وَلَا تَخُطُّہٗ بِیَمِیْنِکَ (عنکبوت)

اور نہ لکھا ہے اس کو تم نے اپنے ہاتھ سے۔

کی خبر دیتے ہوئے اس کا انکشاف کیا ہے کہ صاحبِ وحی صلی اللہ علیہ وسلم لکھنا نہیں جانتے تھے لیکن آپؐ نے ایک نہیں بلکہ اپنے صحابیوں میں سے چالیس

---

[1] اور مسند احمد میں یہ روایت ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَتَانِیْ جِبْرِئِیْلُ فَاَمَرَنِیْ۔

(جبرئیل آئے اور مجھے حکم دیا کہ میں اس آیت کو اس سورۃ کی فلاں جگہ پر رکھوں) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ سورتوں میں نازل ہونے والی آیتوں کو جبرئیلؑ کے (باقی صفحہ ۳۶ پر)

سے ادپر حضرات کو اس کام کے لئے مقرر کر رکھا تھا کہ جس وقت قرآن کی جس سورۃ کی جن آیتوں کی وحی ہو فوراً پہنچ کر ان کو لکھ لیا کریں۔ العراقی نے منظوم سیرت میں ان کاتبوں کے نام گناتے ہوئے نظم کی ابتدا اس مصرعہ سے کی ہے۔

وَكُتَّابُهُ اِثْنَانِ وَاَرْبَعُوْنَ لہ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبوں کی تعداد (۴۲) تھی۔

کاتبوں کی اتنی بڑی تعداد مقرر کرنے کی وجہ یہی تھی کہ وقت پر ایک نہ ملے تو دوسرا اس کو انجام دیدے "عقد الفرید" میں ابن عبدربہ نے حضرت حنظلہؓ بن ربیع صحابی کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے۔

اِنَّ حَنْظَلَةَ بْنِ رَبِيْعٍ كَانَ خَلِيْفَةَ كُلِّ كَاتِبٍ مِّنْ كِتَابِهِ عَلَيْهِ اِذَا غَابَ (عقد الفرید ج ص ۱۴۴)

حنظلہ بن ربیع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام کاتبوں کے خلیفہ اور نائب تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت حنظلہؓ کو یہ حکم تھا کہ خواہ کوئی رہے یا نہ رہے وہ ضرور رہیں تاکہ کاتبوں میں سے اتفاقاً وقت پر اگر کوئی نہ ملے تو کتابت وحی کے کام میں کوئی رکاوٹ نہ واقع ہو۔ اسی انتظام کا یہ نتیجہ تھا کہ نزول کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲) حکم سے آپ شریک کرتے تھے (دیکھو مختصر کنز العمال ص ج ۲) جس کا مطلب یہی ہوا کہ خود رسول اللہ نے نہیں بلکہ ہر آیت جس سورۃ میں جس مقام پر ہے یہ کام بھی جبریل ہی کے حکم سے ہوا ہے

لہ دیکھو الکتانی کی کتاب التراتیب الاداریہ ج ا صـ۱۱۶ مطبوعہ مراکش۔ اسی کتاب میں ان بیالیس کاتبوں کے نام بھی مل جائیں گے۔

ساتھ ہی ہر قرآنی آیت قید کتابت میں آکر قلم بند ہو جاتی تھی۔ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے طبرانی کے حوالہ سے مجمع الزوائد میں یہ روایت ہیثمی نے نقل کی ہے۔

قَالَتْ كَانَ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ يُمْلِيْ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔	ام سلمہ فرماتی ہیں کہ جبریل علیہ السلام قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھواتے تھے

(رواہ الطبرانی فی الاوسط مجمع الزوائد ج ۷، ص ۱۵۷)

بہ ظاہر اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اُترنے کے ساتھ ہی جبریلؑ کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نازل شدہ آیتوں کو لکھوا دیا کرتے تھے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کہ معلوم ہے نہ لکھنا جانتے اور نہ قرآنی آیتوں کو خود لکھا کرتے تھے۔ انتہا اس احتیاط کی یہ تھی کہ جب غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ کے الفاظ بطور اضافہ کے لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ الآیۃ والی مشہور آیت کے متعلق نازل ہوئے۔ مگر یہی اضافہ جو بقول امام مالکؒ حرف واحد کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اس ایک حرفی اضافہ کو بھی اسی وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قلم بند کرنے کا حکم دیا جس وقت وہ نازل ہوا۔ (دیکھو۔ بخاری وغیرہ) امام مالکؒ نے "حرف واحد" اس کو ہارون سے ملاقات کے وقت کہا تھا۔ (دیکھیے درمنثور ج ۲ ص ۲۰۳) احتیاط کا اقتضا یہ بھی تھا کہ لکھوانے پر صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قناعت نہیں فرماتے تھے بلکہ کاتب جب لکھ لیتے تو آپ پڑھوا کر سنتے۔ کاتب وحی حضرت زید بن ثابت کا بیان ہے کہ

فَإِنْ كَانَ فِيْهِ سَقَطٌ	اگر کوئی حرف یا نقطہ لکھنے سے چھوٹ جاتا تو

اَقَامَہٗ (مجمع الزوائد ج ا صنٓا) تو اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم درست کراتے۔
جب یہ سب کام پورا ہو جاتا تب اشاعتِ عام کا حکم دیدیا جاتا تھا پھر جو لکھنا جانتے تھے لکھ لیا کرتے تھے اور زبانی یاد کرنے والے زبانی یاد کر لیا کرتے تھے۔ یہی مطلب ہے زید کے ان الفاظ کا ثمّ اخرج بہ الی الناس (یعنی جب کتابت و تصحیح وغیرہ کے سارے مراتب ختم ہو جاتے تب ہم لوگوں میں اس کو نکالتے یعنی شائع کرتے)

مگر ظاہر ہے کہ ایسی زیر تصنیف متعدد کتابیں جو قرآنی سورتوں کے طریقہ سے تدریجی طور پر مکمل ہو رہی ہوں تو ان کے متعلق یہ خیال کہ وہ مسلسل لکھی جاتیں صحیح نہ ہوگا بلکہ قرآنی سورتوں کی آیتوں کے نزول کا جو حال تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً ان آیتوں کی حیثیت اس قسم کی یادداشتوں کی تھی جنہیں مصنفین اپنی پیش نظر تصانیف کے لیے پہلے جمع کرتے رہتے ہیں اور آہستہ آہستہ ان یادداشتوں کو ان کی متعلقہ کتابوں میں ترتیب کے ساتھ درج کرتے چلے جاتے ہیں۔

"ازالۃ الخفاء" میں شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔ "مثل آں کہ منشی منشآت خود را یا شاعر قصائد و قطعات خود را در بیاضہا وسفینہا مندرج سازد۔" اور اسی سے ان دونوں روایتوں کا مطلب سمجھ میں آتا ہے جو اس سلسلہ میں پائی جاتی ہیں یعنی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً قرآن اس قسم کی چیزوں سے مثلاً رقاع (چمڑا) لخاف (پتھر کی سفید پتلی پتلی تختیاں) کتف (اونٹ

ؑ ازالۃ الخفاء ج ۲ صفحہ ۵

کے مونڈھے کی گول ہڈی) اور عسیب (کھجور کی شاخوں کی جڑ کا وہ کشادہ عریض حصہ جس میں کانٹے والے پتے نہیں ہوتے) یہ اور اسی کی چیزوں میں لکھا جاتا تھا اور اسی کے ساتھ یہ روایت مستدرک حاکم میں پائی جاتی ہے یعنی بعض صحابہ فرماتے تھے کہ:

کنا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم نؤلف القرآن فی الرقاع۔	ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ کر رقاع (چرمی قطعات) میں قرآن کی تالیف کرتے تھے۔

دونوں روایتوں سے قرآن کی کتابت کے دو طبعی مرحلوں کا پتہ چلتا ہے یعنی پہلی صورت کے متعلق تو یوں سمجھیے کہ شاعر اپنے مختلف اشعار کو جیسے وہ نیا رہوتے چلے جاتے ہوں چھوٹے چھوٹے پرزوں پر نوٹ کرتا چلا جاتا ہے۔ پھر جب اس کام سے فارغ ہو جاتا ہے تب ان ہی یادداشتوں سے اپنی غزلوں کو مرتب کرتا ہے، جس شعر کا جس غزل سے تعلق ہوتا ہے اسی میں اس کو داخل کر دیتا ہے سمجھنا چاہیے کہ کچھ یہی صورت قرآن کے متعلق اختیار کی گئی تھی، البتہ اتنا فرق معلوم ہوتا ہے کہ عام لوگ کاغذ وغیرہ معمولی چیزوں پر اپنے منتشر اشعار یا خیالات کو ابتداءً بطور یادداشت کے لکھ لیا کرتے ہیں۔ گویا شاہ ولی اللہ کے الفاظ میں یادداشت کے ان کاغذی پرزوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اگر آں کاغذ را آب برسد یا در آتش بگیرد یا حامل آں بمیرد کا مس ذاہب نابود گردد (یعنی اگر پانی کاغذ کے ٹکڑوں میں پہنچ جائے یا آگ لگ جائے یا جس کے پاس کاغذی یادداشتیں

ہوں وہ مر جائے تو اس طرح ناپید ہو جائیں جیسے گزشتہ کل نابود ہو جاتا ہے مگر آنحضرت صلعم نے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غایت احتیاط سے کام لیتے ہوئے وحی کی ان ابتدائی مکتوبہ یادداشتوں کے لکھوانے کے لئے ایسی چیزوں[1] کا

---

[1] لیکن عام طور پر یہ عجیب بات ہے کہ جن الفاظ میں ان چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے ترجمہ میں لاپروائی سے لوگوں نے کام لیا جس سے غلط فہمی پھیل گئی۔ میں پوچھتا ہوں کہ کوئی یوں کہے کہ اسکولوں میں بچے پتھر کے ٹکڑوں پر لکھتے ہیں یا ہندوستان قدیم میں لکھنے کا جو طریقہ تھا اس کو بیان کرتے ہوئے کہا جائے کہ تاڑ داڑ کے پتوں پر لکھا کرتے تھے کیا یہ واقعہ کی صحیح تعبیر ہو گی ؟ کیا اسکولوں میں سلیٹ پر لکھنے کا جو رواج ہے پتھر کے ٹکڑے کہنا ان کی صحیح تعبیر ہے۔ اسی طرح ہندوستان قدیم میں تاڑ کے پتوں پر یوں ہی لکھا جاتا تھا جن لوگوں نے خود اپنی آنکھوں سے تاڑ کے پتوں پر لکھی ہوئی کتابوں کو نہیں دیکھا ہے صحیح اندازہ شاید ان کو اب بھی واقعہ کی حقیقی نوعیت کا نہیں ہو سکتا لیکن یہی بات یہ ہے کہ کاغذ کے اوراق سے زیادہ بہتر اور محفوظ طریقہ سے تاڑ کے پتوں پر لکھا جاتا تھا۔ جامعہ عثمانیہ میں مسلم کتب خانہ میں یہ کتابیں موجود دیکھیے جو تاڑ کے پتوں پر لکھی گئی ہیں، دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں، بجنسہٖ کچھ اسی قسم کا مغالطہ ان چیزوں کے متعلق بھی عوام میں پھیلا ہوا ہے جن پر قرآنی وحی کی ابتدائی یادداشتوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لکھوایا کرتے تھے۔ مشہور ہو گیا ہے کہ کھجور کی شاخوں بلکہ بعض تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ کھجور کے پتوں یا پتھروں یا ہڈیوں پر قرآن لکھا ہوا تھا۔ سوچنے کی بات تھی کہ کھجور کے پتوں بلکہ اس کی شاخ میں بھی اتنی گنجائش کہاں ہوتی ہے جس پر سطر دو سطر ہی لکھی جا سکے۔ اسی طرح بن گھڑے پتھر یا گری پڑی ہڈیوں پر لکھنا کیا آسان ہے تفصیل کے لئے تو حضرت الاستاذ مولانا گیلانی کی کتاب پڑھیے خلاصہ یہ ہے کہ حدیثوں میں ادیم، لخاف، (باقی صفحہ ۴۰ پر)

انتخاب فرمایا تھا جن کے متعلق یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ عام حوادث وآفات کا نسبتاً

(بقیہ حاشیہ صفحہ) کتف، عسیب، اقتاب کے الفاظ آئے ہیں۔ ادیم باریک کھال سے دباغت کے عمل سے تیار ہوتا تھا۔ عرب جو ایک گوشت خور ملک تھا کافی ذخیرہ ادیم کا ان کے یہاں ملتا تھا حتیٰ کہ خیمہ تک صرف ادیم کے چمڑوں سے تیار کیا جاتا تھا۔ لخاف ہر معمولی پتھر کو نہیں کہتے تھے بلکہ بالاتفاق اہل لغت نے لکھا ہے کہ سفید رنگ کی پتلی پتلی چوڑی چوڑی تختیاں پتھر سے بنائی جاتی تھیں۔ سلیٹ اور ان میں فرق گویا صرف رنگ کا ہوتا تھا اسی طرح اونٹ کے مونڈھے کے پاس کی گول ہڈی طشتری کی طرح بن جاتی ہے۔ اس کو خاص طریقے سے تراش کر نکالا جاتا تھا۔ کاٹنے کے عمل میں کبھی شگاف وغیرہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ رہ جاتا تھا (دیکھو مسند احمد کی روایت از زید بن ثابت صحابی ص۱۸۵) اسی لئے قطعۃ من الکتف بھی اس کو کہتے تھے (مجمع الزوائد ج ۱ ص۱) عسیب کھجور کی شاخ کو نہیں بلکہ پام قسم کے تمام درختوں کی شاخوں کا وہ حصہ جو تنے سے متصل ہوتا ہے اس میں کافی کشادگی پیدا ہو جاتی ہے۔ تاڑ، ناریل، کی شاخوں میں ان کو آپ دیکھ سکتے ہیں عرب کی کھجور کی شاخوں کا یہ حصہ قریب قریب ہندوستان کے ناریل کی شاخوں کے اس حصہ کے برابر ہوتا تھا۔ اس حصہ کو شاخ سے جدا کر لیا جاتا تھا اور ان ہی ٹکڑوں کو خشک کر کے ان پر لکھتے تھے اقتاب، قتب کی جمع ہے، اونٹ کے کجاوہ میں چھوٹی پٹیاں جو استعمال ہوتی ہیں ان کو کہتے ہیں۔ یہ چوڑے چوڑے پتلے پتلے تختوں کے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ تازہ لکڑی کے تختے تازگی کی وجہ سے عموماً کھردرے ہوتے ہیں اور پرانے کجاووں میں امتداد زمانہ سے ان کا کھردرا پن مٹ جاتا تھا، لکھنے کے کام کے بآسانی چھرنے سے وہ بن جاتے تھے۔ بتایا جائے کہ ان تفصیلات سے جو ناواقف ہوگا وہ ان عام پھیلے ہوئے الفاظ سے اگر غلط فہمی کا شکار ہو جائے تو کیا بعید ہے۔ مولانا گیلانی کی کتاب میں مبسوط بحث ان کتابی مواد پر کی گئی ہے۔ میں نے اسی کا خلاصہ یہاں درج کیا ہے۔ ۱۲

زیادہ مقابلہ کر سکتی ہیں۔ اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خلافتِ صدیقی میں حکومت کی طرف سے زید بن ثابت صحابی رضی اللہ عنہ نے قرآن کا ایک نسخہ جو تیار کیا جس کا تفصیلی ذکر آگے آ رہا ہے، تو آنحضرت صلعم کی لکھائی ہوئی یہ ساری یادداشتیں بالکلیہ جوں کی توں اپنی اصلی حالت میں ان کو مل گئی تھیں مکتوبہ یادداشتوں کے اس انبار سے یہ عجیب بات ہے کہ دس پانچ نہیں بلکہ دو تین بھی نہیں صرف سورۂ برأت کی آخری حصہ کی ایک یادداشت جس میں صرف دو آیتیں تھیں یہی اور فقط یہی ایک یادداشت والا ٹکڑا اس پورے ذخیرے میں ان کو نہ مل سکا، لیکن ظاہر ہے کہ صحابۂ کرام کے سینوں میں اور ان کے ذاتی مکتوبہ قرآنی نسخوں میں یہ آیتیں موجود تھیں بلکہ بطور وظیفہ کے ان کے پڑھنے کا معلوم ہوتا ہے کہ عام رواج بھی تھا۔[1]

---

[1] ابوداؤد وغیرہ صحاح ستہ کی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اس باب میں جو مروی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ برأت کی آخر کی ان آیتوں کے متعلق رسول اللہ اپنے صحابیوں سے فرمایا کرتے تھے کہ صبح و شام جو آدمی ان کی تلاوت سات مرتبہ کرے گا اللہ تعالیٰ دنیا اور دین کی مشکلات اس کی برکت سے حل کر دیں گے۔ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن آیتوں کی یہ خاصیت بیان کی ہو، کون ہوگا جو معلوم ہو جانے کے بعد ان سے مستفید نہ ہوتا ہوگا۔ اس سلسلہ میں بعض عملی تجربات بھی لوگوں کو صحابہ ہی کے زمانہ میں ہوئے تھے۔ محمد بن کعب نے اس فوجی مہم کا ذکر کرتے ہوئے جس نے روم کے علاقہ پر حملہ کیا تھا یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک فوجی سپاہی کی ٹانگ ٹوٹ گئی، راستہ میں لے جا رہے اٹک گئے۔ اتنے میں کسی نے ان کو سورۂ

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

بہرحال اس وقت تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسی ایک ٹکڑے کے سوا جس میں سورۂ برأت کی دو مشہور ورد کی آیتیں تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھائی ہوئی تمام ابتدائی یادداشتوں کا خلافتِ صدیقی کے زمانہ میں مل جانا خود بھی ایک ایسا واقعہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی چیزوں پر ان کے لکھنے کا انتظام کیا گیا تھا جو اتنی طویل مدّت یعنی چو بیس پچیس سال تک حوادث و آفات سے محفوظ رہ سکیں اس لیے کہ نزولِ وحی کی ابتدا سے حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کے اس عہد تک جس میں قرآن کے متعلق حکومت کے حکم سے حضرت زید بن ثابت نے کام کیا، اتنی ہی مدت ہونی چاہیے۔

بہرحال ایام جاہلیت کی تاریخ سے جو جاہل ہیں ان کا یہ خیال قطعًا بے بنیاد ہے کہ لکھنے کے سامان کی کمیابی کی وجہ سے رسول اللہ قرآن کی ابتدائی یادداشتوں کو اس قسم کی چیزوں یعنی چمڑے یا "لخاف" (سنگی باریک تختیوں) عسیب (شاخ خرما کی جڑ کا عریض حصّہ) کتف (شانۂ شتر) وغیرہ پر لکھوایا کرتے تھے، یقینًا یہ وہی کہہ سکتا ہے جسے جاہلی عرب کے صحیح حالات کا علم نہیں ہے، تفصیل تو آگے آرہی ہے کچھ نہیں تو ابھی مستدرک حاکم کی جو روایت گذری جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی آیات کی کتابت کے پہلے مرحلہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱) برأت کے انہی الفاظ کا وظیفہ بتایا اور کہا کہ اسی کو پڑھ کر ٹوٹے ہوئے مقام کو جھاڑا کرو، لکھا ہے کہ عمل سے اس کی تصدیق ہوئی، یعنی ٹانگ ان کی درست ہوگئی اور اتنی درست کہ گھوڑے پر سوار ہو کر فوج میں پھر آکر مل گئے۔ (دیکھو درمنثور ج ۲ ص ۹۷)

کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد بیٹھ کر رقاع میں صحابہ قرآن کو جمع کرتے تھے' اور رقاع جیسا کہ معلوم ہے رقعہ کی جمع ہے۔ یہ چمڑے کے خاص قسم کے ٹکڑے ہوتے تھے جو لکھنے ہی کے لئے تیار کیے جاتے تھے گویا پارچمنٹ (PARCHMENT) جسے عربی میں رق کہتے ہیں اسی کی تعبیر رقاع کے لفظ سے کی گئی ہے یا پارچمنٹ ہی کی کسی خاص قسم کا نام رقاع تھا۔

آخر اس وقت رقاع[1] سے جیسے کام لیا جاتا تھا۔ ابتدائی کتابت کے وقت بھی کیا یہی رقاع نہیں مل سکتا تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ قرآن ہی میں لوگ یہود کے متعلق،

كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا۔ ان کی مثال اس گدھے کی ہے جو کتابیں لادے ہو۔ اور ان جیسی دوسری آیتیں پڑھتے ہیں، اور اسی کے ساتھ یہ بھی باور کیے جاتے ہیں کہ عرب کتابی سازوسامان سے بالکل خالی تھا۔ یہودیوں کو تو لکھنے کے لیے

---

[1] لغت کی کتاب مجمع البحار میں "رقاع" کی تحقیق کرتے ہوئے ایک دوسری حدیث بھی نقل کی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن لوگ آئیں گے وَعَلٰی رَقَبَتِهٖ رِقَاعٌ تَخْفُقُ پھر اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے اَرَادَ بِالرِّقَاعِ مَا عَلَيْهِ مِنَ الْحُقُوْقِ الْمَكْتُوْبَةِ فِي الرِّقَاعِ جس کا مطلب یہی ہوا کہ دین اور قرض وغیرہ جیسے مطالبات ادا کیے بغیر مر جائیں گے قیامت کے دن ان مطالبات کے وثائق کو اپنی اپنی گردنوں میں باندھے نمودار ہوں گے اور مطالبات کے یہ وثائق رقاع میں لکھے ہوں گے جس سے معلوم ہوا کہ رقاع کا یہ لفظ جو رقعہ کی جمع ہے اس کے متعلق یہ بات کہ وثائق اس پر لکھے جاتے تھے۔ عرب کا عام دستور تھا گویا کاغذ کے لفظ کا جو حال اس وقت اردو میں ہے بلکہ رقعہ کا لفظ اردو میں بھی تو آج تک لکھی ہوئی تحریروں کے لئے بولا جاتا ہے۔ دیکھو مجمع البحار ج ۲ ص ۲۳۔

اتنا سامان مل سکتا تھا کہ گدھے بن کر اس کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لاد سکتے تھے لیکن پیغمبر کو قرآن کے چند اوراق کے لیے، وہی چیزیں نہیں مل سکتی تھیں جن پر یا خر کے برابر یہ کتابیں لکھا کرتے تھے۔ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ط

واقعہ یہ ہے کہ عرب کے ایام جاہلیت کی تاریخ سے جو واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس ملک کے شمال و جنوب[1] میں کتب خانوں کے مختلف مراکز پائے جاتے تھے جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے، بہرحال ان تاریخی روایات کی روشنی میں قرآن کے اجمالی بیان کی یہ تشریح پیدا ہوتی ہے کہ قرآن کی ہر آیت کو ایک تو اس وقت لکھ لیا جاتا تھا جس وقت وہ نازل ہوتی تھی پھر ہر ہر سورت مرتب ہونے کے بعد جس حد تک پہنچ جاتی تھی، رسول اللہ صلعم اپنے صحابیوں کو لکھوا دیتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ کر قرآن لکھنے کے جس کام کا ذکر مستدرک حاکم والی روایت میں کیا گیا ہے اس میں کتابت قرآن کی اسی دوسری منزل کا پتہ ان الفاظ میں جو دیا گیا ہے کہ وہ "ہم تالیف کرتے تھے" صحابہ کے ان

---

[1] یمن میں یہودی اور عیسائی مذہب پھیلا ہوا تھا اور بڑے بڑے چرچ یہاں قائم تھے، جن میں ان مذاہب کا لٹریچر اور اس کی بے شمار کتابیں پائی جاتی تھیں، نہ صرف گرجوں میں بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ انفرادی طور پر بھی علماء یہود و نصاریٰ کے پاس کتابوں کا کافی ذخیرہ رہتا تھا۔ کعب احبار ہی کا حال طبقات ابن سعد وغیرہ میں پڑھیے جس سے میرے اس بیان کی توثیق ہوگی اسی طرح شمال عرب میں خیبر یہود کا مرکز تھا جہاں ان کے دین کی کتابیں بکثرت ملتی تھیں خود مدینہ منورہ کے قریب مقام قف میں یہودیوں کا بیت المدارس یا مدرس تھا جس میں تاریخی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابیں بھی تھیں ۱۲ (مناظر احسن گیلانی)

ناظ سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف سورتوں میں جدید اضافے وحی کے ذریعہ جو
تے رہتے تھے ان اضافوں کو متعلقہ سورتوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ
کے حکم سے آپ کے سامنے بیٹھ کر جوڑتے تھے اور یوں تدریجاً قرآن کی ان
رتوں کے وہ نسخے جو صحابہ کے پاس جمع ہوتے چلے جاتے تھے مکمل ہوتے رہتے۔

ستدرک حاکم کی مذکورہ بالا روایت یعنی صحابی کا بیان كُنَّا حَوْلَنَا عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
فُ الْقُرْآنَ فِي الرِّقَاعِ (ہم لوگ رسول اللہ کے اردگرد بیٹھ کر قرآن کو رقاع میں تالیف کرتے
خود اسی میں تالیف کرنے کا جو ذکر ہے اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف نقل نہیں کرتے تھے بلکہ جن جن
رتوں کی متعلقہ آیتیں اس وقت تک نازل ہو چکی ہوتیں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے
سورتوں کے ان مقامات پر ترتیب دیکر لکھا کرتے تھے جہاں پر ان کو ہونا چاہیے تھا، بیہقی نے بھی
ث کا مطلب یہی لیا ہے۔ لکھا ہے کہ اَلْمُرَادُ تَالِيْفُ مَا نَزَلَ مِنَ الْاٰيَاتِ الْمُفْرَدَةِ
وَرِهَا وَجَمْعِهَا (حاشیہ بخاری ج ۲ ص۷۴۵، مطبوعہ ہند) جس کا حاصل وہی ہے جو
نے عرض کیا۔ اس کثرت سے صحابیوں نے براہ راست قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ
کے سامنے لکھا تھا کہ عہد عثمانی میں جب حکومت کی طرف سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ جس جس کے
پورا قرآن یا اس کی سورتیں ہوں تو ان کو لے کر حاضر ہوں تو بیان کیا جاتا ہے کہ لوگوں
لا کر جمع کرنا شروع کیا فَكَانَ الرَّجُلُ يَجِيْءُ بِالْوَرَقَةِ وَالْاَدِيْمِ فِيْهِ الْقُرْآنُ یعنی
ورق اور چمڑے میں لکھے ہوئے قرآن کے ساتھ حاضر ہوئے) اسی میں یہ بھی ہے کہ حَتّٰى جُمِعَ مِنْ
كَ كَثْرَةٌ (یعنی بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا) بہرحال کہنے کی بات یہ ہے جب یہ سارا ذخیرہ جمع
ا تب حضرت عثمانؓ تشریف لائے۔ روایت ہے:

اهُمْ رَجُلًا رَجُلًا فَنَاشَدَهُمْ اَسَمِعْتَ رَسُوْلَ اللّٰهِ — ایک ایک آدمی (یعنی صحابی) کو
اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ اَمْلَاهُ عَلَيْكَ فَيَقُوْلُ — بلاتے اور قسم دے دیکر فرماتے کہ واقعی

(باقی ص۴۶ پر)

پس یہی نہیں کہ قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر صحابہ
صرف زبانی ہی یاد کر لیا کرتے تھے بلکہ جو لکھنا جانتے تھے وہ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے پاس بیٹھ کر جیسے جیسے سورتیں مکمل ہوتی چلی جاتی تھیں ان کو لکھتے بھی
چلے جاتے تھے اور آنحضرت کے منشا کے مطابق ان کو مرتب کرتے جاتے تھے اسی لیے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے جس وقت تشریف لے گئے تو صحابہ کے سینوں میں بھی
تھا اور ان کے سفینوں میں بھی قرآن محفوظ تھا سینوں کی حفاظت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا
ہے کہ عہد نبوت ہی میں بیر معونہ کا واقعہ پیش آیا تو جیسا کہ بخاری میں ہے شہید
ہونے والوں کی تعداد ستر کے قریب تھی۔ دھوکہ دے کر کفار نے ان کو قتل
کر دیا تھا اور یہ سارے کے سارے قراء یعنی حافظ قرآن تھے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کی وفات کے کل ایک سال بعد عرب کی ایک مقامی شورش کو دبانے
کے لئے عہد صدیقی میں یمامہ (نجد) فوجی دستہ بھیجا گیا تھا لیکن اتفاقاً کثیر
تعداد شہید ہو گئی، اس میں بھی یہی بیان کیا گیا ہے کہ قرآن کے حفاظ
تعداد سات سو تھی جیسا کہ بخاری کے حاشیہ میں ہے۔

كَانَ عِدَّةُ مِنَ الْقُرَّاءِ   قرآن کے حفاظ اس جنگ میں جتنے شہید

بقیہ حاشیہ صفحہ (۴۶) نعم (کنز العمال ج ۱ ص ۲۸۱) تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ
سن کر لکھا ہے۔ صحابی کہتے کہ ہاں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں قرآنی سورتوں
کی ایسی نقلیں کتنی کثرت سے صحابہ میں پھیل چکی تھیں جو براہ راست خود رسول اللہ
لکھوائی ہوئی تھیں۔ ۱۲   (مناظر احسن گیلانی)

سبعمائة (ج ۲ ص۴۳) شہید ہوئے تھے ان کی تعداد سات سو[1] تھی۔

[1] اس تعداد پر تعجب نہ کرنا چاہیے عام تاریخوں مثلاً طبری وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہزار اور کئی سو آدمی مسلمانوں کی فوج کے یمامہ کی اسی مہم میں شہید ہوئے تھے، شہداء میں بڑے بڑے لوگ مثلاً سالم مولیٰ ابی حذیفہ اور حضرت عمرؓ کے حقیقی بھائی زید بن الخطاب رضی اللہ عنہما اس جنگ میں کام آئے۔ قرآن کے متعلق حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ کو خاص خصوصیت صحابہ میں حاصل تھی۔ بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن چار صحابیوں سے قرآن پڑھنے کا حکم عام مسلمانوں کو دیا کرتے تھے۔ ان میں ایک سالم بھی تھے طبری وغیرہ سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ سالم کے ساتھ جو فوجی دستہ تھا وہ اہل القرآن کا فوجی دستہ سمجھا جاتا تھا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے سالم ہی سے قرآن پڑھا تھا، اور استاد کے ساتھ سب ہی شہید ہوئے تھے، حضرت سالم کہتے بھی تھے کہ ہم قرآن والے لوگ ہیں پیچھے ہٹ نہیں سکتے اور واقعہ یہ ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم براہ راست لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے صحابی بیان کرتے ہیں کہ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر رسول اللہؐ ہم لوگوں کو قرآن یاد کراتے تھے خود صحابہ پر بھی قرآن کے سیکھنے پڑھنے اور یاد کرنے کا جو بے پناہ جذبہ مسلط تھا اور اسی کے ساتھ اس کا بھی اگر خیال کیا جائے کہ امامت سے لے کر قبر میں دفن ہونے تک امتیاز اور ترجیح کا واحد معیار عہد نبوت میں صرف یہ تھا کہ قرآن جس کو زیادہ یاد ہو وہی امام بنایا جاتا تھا اور شہیدوں میں دفن کے وقت اسی کو پہلے دفن کیا جاتا تھا جو قرآن کے یاد کرنے میں زیادہ آگے ہوتا تھا۔ عرب کا دماغ عام مشغولیت سے اس وقت خالی تھا علمی پیاس ان میں جب پیدا ہوئی تو سب سے پہلے تشنگی بجھانے کے لئے ان کو قرآن ہی ملا، صحابہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ قرآن ان کے سینوں میں اس طرح جوش مارتا رہتا تھا جیسے کھولتی ہنڈیا جوش مارتی ہے جہاں کہیں ایک جگہ چند صحابی جمع ہو جاتے تھے تو لوگوں کا

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

ایک معمولی مقامی مہم میں شہید ہونے والوں کے اندر خیال تو کیجئے کہ جب سات سات سو صحابی ہوتے تھے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صحابہ میں کتنی زیادہ تعداد حفاظ کی پائی جاتی تھی اور یہی حال مکتوبہ نسخوں کی کثرت کا معلوم ہوتا ہے جو ان ہی صحابیوں کے پاس موجود تھے۔ مکہ کے ابتدائی زمانہ ہی میں کون نہیں جانتا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام میں اسی وجہ سے داخل ہوئے تھے کہ ان کی بہن قرآن پڑھ رہی تھیں۔ انہوں نے اس کو چھیننا چاہا تو بہن نے انکار کر دیا۔ یہ واقعہ مشہور ہے اور سب جانتے ہیں۔ کچھ نہیں تو ابتداءِ اسلام کا یہی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷) بیان ہے کہ دوی کدوی النحل (شہد کی مکھی کی بھنبھناہٹ) کی آواز گونجنے لگتی تھی۔ یعنی قرآن کا ورد ہر ایک شروع کر دیتا تھا۔ ان حالات میں اس پر کیوں تعجب کیجئے اگر یمامہ کی لڑائی میں سات سو قرآن کے حفاظ شہید ہو گئے۔ واقعہ کی اہمیت ہی کا تقاضا تو ہوا جو اس عظیم سانحہ کے بعد حضرت عمرؓ نے ابوبکرؓ کو قرآنی سورتوں کی شیرازہ بندی پر اصرار کے ساتھ آمادہ کیا۔۱۲ (مناظر احسن گیلانی)

لہ سیرۃ ابن ہشام میں ہے کہ بہن کے زدوکوب سے فارغ ہونے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طبیعت میں شرمندگی سی محسوس ہوئی اور بہن سے بولے اَعْطِینِی الصَّحِیفَةَ الَّتِی سَمِعْتُکُمْ تَقْرَؤُنَ اٰنِفًا (ص۲۱۷ ج بر روض) یعنی جو صحیفہ (کتاب) تم لوگوں سے میں نے سنا پڑھتے ہوئے مجھے دو۔ اس پر ان کی بہن نے کہا تم ناپاک ہو ایسی حالت میں اس کو چھو نہیں سکتے۔ "فَاغْتَسَلَ فَاَعْطَتْهُ الصَّحِیفَةَ" تب حضرت عمر نے غسل کیا اور ان کی بہن نے صحیفہ ان کو دیا) صحیفہ دینے کے اس قصہ کا ذکر علاوہ سیر کی کتابوں کے دارقطنی کی سنن میں بھی ہے۔ البتہ بجائے غسل کے اس میں وضو کرنے کا تذکرہ (باقی ص۴۹ پر)

ایک واقعہ اس عامیانہ خیال کی تردید کے لئے کافی ہے کہ ابتدائی یادداشتوں کے سوا قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک کتابی شکل حاصل نہ کر سکا، کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمان عورتوں تک کے پاس قرآن کی نقلیں مکہ معظمہ ہی میں جب پائی جاتی تھیں تو زمانہ جیسے آگے کی طرف بڑھا کوئی وجہ ہو سکتی تھی کہ صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کی نقل نہ حاصل کرتے ہوں، ذرا خیال تو کیجئے کہ بخاری وغیرہ میں لوگ یہ بھی پڑھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابیوں کو منع فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کو لے کر دشمن کے علاقہ میں نہ جایا کرو اگر مکتوبہ شکل میں قرآن کے نسخے صحابہ کے پاس موجود ہی نہ تھے تو اس حکم کے معنی کیا ہوں گے۔ اسی طرح روایتوں میں ہے کہ ناظرہ[1] یعنی دیکھ کر قرآن کے پڑھنے کا ثواب رسول اللہ فرماتے تھے کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ) کیا گیا ہے۔ بہر حال "ثم اخذ الصحیفۃ" کے الفاظ اس روایت میں بھی ہیں، روض الانف میں لکھا ہے کہ اس صحیفہ میں صرف ایک سورۂ طٰہٰ ہی نہیں تھی بلکہ طٰہٰ کے سوا کا بھی پتہ چلتا ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ کی سورۃ بھی اس صحیفہ میں تھی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن سے مانگ کر پڑھا تھا دیکھو ج ا ص ۲۱۷ روض الانف سہیلی ۱۲

[1] مثلاً حدیثوں میں ہے کہ ناظرہ دیکھ کر قرآن پڑھنے کا درجہ اسی قدر بلند ہے جتنا کہ فرض نماز کو نفل نماز پر فضیلت حاصل ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اللہ رسول کو جو دوست رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ قرآن کو مصحف میں پڑھے، اور یہ روایتیں تو صحاح کی عام کتابوں میں پائی جاتی ہیں مگر دارمی کی وہ تاریخی روایت جس میں ہے کہ رسول اللہ آخری خطبہ میں جب اس مقام پر پہنچے یعنی فرما رہے تھے کہ لوگو قبل اس کے کہ علم اٹھا لیا جائے (باقی صفحہ ۵۰ پر)

زیادہ ہے، کیا اس حکم کی تعمیل مکتوبہ قرآن کے بغیر ممکن تھی پس واقعہ یہی ہے جیسا کہ صحابہ خود ہی بیان کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ کر وہ قرآن کی نقل حاصل کیا کرتے تھے اور یوں بکثرت قرآنی سورتوں کی نقلیں صحابہ کے پاس موجود تھیں لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ قرآن کی یہ سورتیں جن کی حیثیت مستقل رسالوں اور کتابوں کی تھی ان سب کو ایک ہی تقطیع اور سائز کے اوراق پر لکھوا کر ایک ہی جلد میں مجلد کرانے کا طریقہ رسول اللہ کے عہد میں مروج نہیں ہوا تھا بلکہ ایک ہی مصنف کی مختلف کتابیں الگ الگ جلدوں کی شکل میں جیسے آج کل چھپی ہوئی ملتی ہیں سمجھنا چاہیے کہ یہی حال گویا عموماً قرآن کی ان سورتوں کا تھا۔ اگرچہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انفرادی طور پر ایک سے زائد صحابیوں نے یہ کام بھی کر لیا تھا، یعنی ایک ہی سائز پر لکھ کر ایک ہی جلد کی صورت میں قرآن کو جمع کر لیا تھا۔ لیکن اس کا عام رواج نہیں ہوا تھا۔[۱] آنحضرت صلعم کے بعد عہد

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اس کو حاصل کرو اس پر ایک اعرابی نے کہا کہ کیا علم اٹھا لیا جائے گا حالانکہ "المصاحف" یعنی مکتوبہ قرآن کے نسخے ہمارے درمیان موجود ہیں۔ کیا اس سے زیادہ صریح شہادت اس بات کی مل سکتی ہے کہ عہد نبوت میں گھر گھر قرآن کے نسخے پھیل چکے تھے اس سلسلے میں چاہا جائے تو اور بھی بہت سی روایتیں پیش ہو سکتی ہیں ۱۲۔ مناظر احسن گیلانی

[۱] میرا اشارہ بخاری وغیرہ کی اس روایت کی طرف ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں قرآن کو چار آدمیوں نے جمع کیا اور یہ سب انصاری تھے، یعنی ابی بن کعب، معاذ بن جبل ابو زید اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم عام طور

(باقی صفحہ ۵۱ پر)

صدیقی میں قرآن کی جو مشہور خدمت انجام دی گئی ہے اس کا تعلق اسی واقعہ

(بقیہ صـــ) جمع کرنے کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ زبانی یاد کیا تھا مگر بیر معونہ میں شتر صحابی جو شہید ہوئے تھے ان کی طرف جَمَعُوا الْقُرْآنَ (یعنی انہوں نے قرآن کو جمع کیا تھا) یہ الفاظ منسوب کیے گئے ہیں۔ ابن شہاب زہری بجائے جَمَعُوا کے دَعُوهُ کا لفظ اس موقع پر استعمال کرتے تھے۔ یعنی زبانی یاد کیا تھا۔ ان لوگوں نے قرآن کو (کنز العمال) پھر بخاری میں جن چار انصاری صحابیوں کی طرف جمع قرآن کی خدمت کو جو منسوب کیا گیا ہے یقیناً اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ جمع قرآن کی اس خدمت کی نوعیت یاد کرنے سے یعنی سینہ میں جمع کرنے سے مختلف تھی، اور وہ یہی ہو سکتی ہے کہ بجائے سینوں کے مانا جائے کہ ان چار انصاری بزرگوں کے پورے قرآن کو یعنی اس کی ہر ہر سورۃ کو ایک ہی سائز کے اوراق پر لکھنے کی امتیازی خدمت انجام دی تھی جس کی تعبیر جمع کرنے کے لفظ سے کی گئی ہے، بلکہ چار صحابیوں کے جمع کرنے کا ذکر جس روایت میں کیا گیا ہے اسی روایت کے دوسرے طریقوں کے جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ جمع قرآن کی یہ خدمت انہیں چار تک راوی نے جو محدود کی ہے اس کا تعلق انصار سے ہے یعنی تمام سورتوں کو ایک ہی تقطیع کے اوراق پر لکھ کر سب کو ایک جگہ جمع کرنے کا کام انصاری صحابیوں میں سے ان چار نے انجام دیا تھا۔ محمد بن کعب القرظی کے حوالہ سے کنز العمال ہی میں جو روایت ہے اس میں یہ الفاظ بھی ہیں "جَمَعَ الْقُرْآنَ فِي زَمَانِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَمْسَةٌ مِنَ الْأَنْصَارِ" (یعنی انصار کے پانچ آدمیوں کا یہ حال تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ کے زمانے میں انہوں نے قرآن جمع کیا تھا) جس سے معلوم ہوا کہ انصار میں بھی جمع کرنے والوں کی تعداد چار سے زیادہ تھی، اور یہ بات تو واضح ہی ہو گئی کہ اس قصہ کا تعلق صرف انصار

(باقی صفحہ ۵۲ پر)

سے ہے میرا اشارہ بخاری وغیرہ کی اسی مشہور روایت کی طرف ہے جس میں
بیان کیا گیا ہے کہ یمامہ میں حفاظِ قرآن کے شہدا کی غیر معمولی کثرت کو دیکھ کر حضرت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۱) کے طبقہ سے تھا نیز طبرانی کے حوالہ سے کنز العمال ہی میں ایک روایت یہ بھی
ہے کہ انصار میں سے مجمع بن جاریہ نے بھی قرآن جمع کیا تھا بجز دو یا تین سورتوں کے اس سے بھی
یہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی مصنف کی جیسے کل کتابیں لوگ جمع کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن اکثروں
کے پاس کل تصنیفات نہیں ہوتے، عہد نبوت میں عام صحابہ کا قرآنی سورتوں کے متعلق یہی حال
تھا۔ کنز العمال میں ابن داؤد کی کتاب المصاحف کے حوالہ سے صحابہ کے متعلق یہ الفاظ صراحۃً بھی
منقول ہیں "کُتِبَ ذٰلِكَ فِي الصُّحُفِ وَالْاَلْوَاحِ" (یعنی صحابہ نے قرآن کو صحیفوں
اور تختیوں میں لکھ لیا تھا) ج ۲ صفحہ ۵۱ بر مسند احمد۔ میں لوگوں سے کیا کہوں کنز العمال ہی
اس واقعہ کا تذکرہ جو ملتا ہے کہ قیس بن مروان نامی ایک صاحب کوفہ سے حضرت عمرؓ کے
پاس آئے اور آکر عرض کیا کہ ایک شخص کو کوفہ میں چھوڑ کر آیا ہوں جو قرآن کو زبانی لکھواتا
راوی کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ یہ سن کر غصے سے بے خود ہو گئے، اور غصے میں فرما رہے تھے ارے یہ کون
شخص ہے جو ایسی حرکت کرتا ہے قیس نے کہا کہ عبد اللہ بن مسعودؓ یہی کرتے ہیں۔ ابن مسعودؓ
نام سن کر حضرت عمرؓ کچھ ٹھنڈے پڑ گئے۔ اور فرمایا کہ "خیر قرآن کے جاننے والوں میں میں نہیں
جانتا کہ ان سے بھی بڑا عالم کوئی رہ گیا ہے"۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس روایت کے
یہ خیال کہ عام طور پر قرآن کو زبانی لکھوانے کی ممانعت تھی اور یہ کہ جو بھی قرآن لکھتا تھا
کسی مکتوبہ نسخہ سے نقل کرتا تھا، اگر قائم کیا جائے تو اس کے سوا کیا کوئی دوسرا
احتمال پیدا ہوتا ہے۔ ۱۲۔

(مناظر احسن گیلانی)

عمرؓ کی درخواست پر صدیق اکبرؓ نے آنحضرت صلعم کے خصوصی کاتب وحی زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ ایک نسخہ قرآن کا وہ تیار کریں۔

نہ سمجھنے والوں نے خدا جانے اس روایت سے کیا کچھ سمجھ لیا اور عجیب و غریب نتائج پیدا کر لیے۔ بعض اس روایت کو پیش کر کے مدعی ہو گئے کہ قرآن نے کتابی قالب عہد صدیقی ہی میں اختیار کیا ورنہ اس سے پہلے قرآن کی حیثیت زبانی یادداشتوں کی سی تھی۔ مگر جو کچھ اب تک عرض کیا جا چکا ہے اس سے واقف ہونے کے بعد کوئی صاحب فہم لمحہ بھر کے لئے کیا اس مغالطہ میں مبتلا رہ سکتا ہے؟ لوگ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ فقط لکھوانے ہی کا اگر قصہ ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہنے کی کیا ضرورت تھی وہ تو خود لکھنا جانتے تھے۔ طرفہ ماجرا یہ ہے کہ ابوبکر صدیقؓ نے اس فرمان کے نافذ کرنے میں کش مکش کا اظہار کیا مگر بعد کو وہ راضی ہو گئے، انہوں نے کہا تھا کہ میں اس کام کو کیسے کروں جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ بخاری میں حضرت صدیق اکبرؓ کی طرف یہ الفاظ منسوب کیے گئے ہیں كَيْفَ أَفْعَلُ شَيْئًا لَمْ يَفْعَلْ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (میں اس کام کو کیسے کروں جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا)

کیسی عجیب بات ہے کہ رسول اللہؐ کا تو قاعدہ تھا کہ اترنے کے ساتھ ہی قرآن کی ہر آیت کو لکھوا دیتے تھے، پھر حضرت ابوبکرؓ کا یہ کہنا کہ "رسول اللہؐ نے جس کام کو نہیں کیا اس کام کو کیسے کروں" اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے اگر اس قصہ کا تعلق قرآن اور قرآنی سورتوں کے صرف لکھوانے اور قلمبند کرانے سے ہوتا جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے۔

عہد صدیقی میں قرآنی خدمت کی صحیح نوعیت

پس اصل واقعہ وہی ہے کہ قرآن کی تمام سورتوں کو ایک ہی تقطیع اور سائز پر لکھوا کر ایک ہی جلد میں مجلد کروانے کا کام اور وہ بھی حکومت کی طرف سے اس کام کو انجام دلانا یہی ایسا کام تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہیں ہو پایا تھا۔ حضرت عمرؓ اسی خدمت کو حکومت کی طرف سے انجام دلانے کا مطالبہ کر رہے تھے، چاہتے تھے کہ خلافت اور حکومت اس مہم کو اپنے ہاتھ میں لے اور اپنی نگرانی میں اس کی تکمیل کرائے۔ بلاشبہ یہ ایک نیا اقدام تھا اور ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس اقدام کے متعلق اگر تردد ہوا تو اس کی یقیناً گنجائش تھی، لیکن بعد کو خود ان کا فیصلہ بھی یہی ہوا کہ بجائے متفرق رسالوں کی صورت میں رہنے کے یہ زیادہ مناسب ہے کہ تمام قرآنی سورتوں کو ایک ہی تقطیع کے اوراق پر لکھوا کر ایک ہی جلد میں سب کو مجلد کرا دیا جائے۔ پھر جیسا کہ سب جانتے ہیں بخاری کی اسی روایت میں ہے کہ حضرت زید بن ثابت کا حکومت کی طرف سے اس خدمت کے انجام دینے کے لیے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انتخاب فرمایا اور زید بن ثابتؓ نے بڑی محنت اور جانفشانی سے اس کام کو پورا کیا[1]۔ کام کی رپورٹ کرتے ہوئے زید بن ثابت

---

[1] امام شہاب زہری سے اور شہاب زہری عبداللہ بن عمر کے صاحبزادے سالم کے حوالہ سے یہ روایت نقل کرتے تھے کہ زید بن ثابت نے "القراطیس" پر ابوبکر کے حکم سے قرآن کی کل سورتوں کو لکھا تھا۔ غالباً ایک ہی تقطیع کے اوراق جب بنائے جاتے تھے تو ان کو قراطیس کہتے تھے (دیکھو اتقان ص ۶۰ ج ۱) ایک سائز کے اوراق پر لکھے ہونے کی وجہ سے ابوبکر صدیق رضؓ کی حکومت کے مرتب کردہ اس نسخہ کو "ربعہ" بھی کہتے تھے (دیکھو اتقان ص ۵۹) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ طول و عرض ان اوراق متساوی تھا۔ مربع جس کا ترجمہ "چوکھونٹا" کیا جا سکتا ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ (مناظر احسن گیلانی)

نے وہی باتیں کہیں جو آج بھی کتابوں کے نقل کرنے والے خصوصاً قرآن جیسی اہم کتابوں کے لکھنے اور چھاپنے والے عموماً کہا کرتے ہیں۔ یعنی[1] مختلف نسخوں کو بھی انہوں نے لکھتے وقت پیشِ نظر رکھا۔ اسی[2] سلسلہ میں آنحضرت صلعم کی لکھوائی ہوئی ابتدائی یادداشتیں جو رقاع، عسیب، لخاف وغیرہ پر تھیں ان کو بھی انہوں نے اپنے سامنے لکھتے وقت رکھ لیا تھا، نیز ہر آیت کی تصحیح دو دو حافظوں سے بھی کرتے چلے جاتے تھے، البتہ وہی سورۂ براءت کی آخری دو آیتیں ان کے متعلق رپورٹ میں انہوں نے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ آنحضرت صلعم کی لکھائی ہوئی یادداشتوں میں وہ یادداشت نہ ملی جس میں یہ آیتیں لکھی ہوئی تھیں اسی کے ساتھ یہ بھی بیان کیا کہ دو حافظوں کی تصحیح کی جو شرط تھی اس کی پابندی بھی ان آیتوں کے متعلق میں نے نہیں کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست ان کو میں سنتا رہا اور ایک صحابی جن کی شہادت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو شہادتوں کے متساوی قرار[1] دیا تھا یعنی خزیمہ[2] بن ثابت انصاری کی

---

[1] واقعہ یہ ہوا تھا کہ ایک بدوی جس کا نام سوا بن قیس المحاربی تھا اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک گھوڑے کی فروخت کا معاملہ کیا مگر بعد کو مکر گیا۔ اور بولا کہ معاملہ کس کے سامنے ہوا۔ واقعہ یہ تھا کہ معاملہ کے وقت کوئی دوسرا موجود نہ تھا خزیمہ انصاری نے کھڑے ہو کر کہا کہ بیشک معاملہ ہوا تھا۔ رسول اللہ نے پوچھا کہ تم کب موجود تھے جو گواہی دے رہے ہو۔ خزیمہ نے کہا کہ آپ کی رسالت کو جب ہم حق سمجھتے ہیں تو بھلا گھوڑے کے معاملہ میں آپ کوئی خلاف واقعہ دعویٰ فرما سکتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی موقعہ پر فیصلہ فرمایا کہ خزیمہ جس کی موافقت یا مخالفت میں گواہی دیں ان کی گواہی

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

تصحیح کو کافی سمجھا جس کی وجہ غالباً وہی کہ سورۂ برأت کی ان آیتوں کو بطور وظیفہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابیوں کو پڑھنے کا عام حکم دے رکھا تھا، اسی لئے عام طور پر دونوں آیتیں جانی پہچانی تھیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۵) کافی قرار دی جائے گی۔ (اسد الغابہ ج ۲ ص ۱۹۴)

لے ان صحابی کا نام خزیمہ تھا یا ابوخزیمہ، بخاری تک کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ راویوں سے کسی راوی کو ان کا نام خزیمہ یاد رہا اور کسی کو ابوخزیمہ اگرچہ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ خزیمہ نام بتانے والے صحت سے زیادہ قریب ہیں ان روایتوں میں ایک اختلاف یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق عہد صدیقی کی قرآنی خدمت سے تھا یا یہ حضرت عثمان کی حکومت نے جو کمیٹی بٹھائی تھی اس وقت یہ واقعہ پیش آیا تھا مگر ظاہر ہے کہ عہد عثمانی میں اس واقعہ کے پیش آنے کی صورت ہی کیا تھی۔ عہدِ صدیقی میں قرآن کے سارے اجزا کی شیرازہ بندی ہو چکی تھی عہدِ عثمانی میں تو صرف عہد صدیقی کے اسی مرتبہ نسخہ کی نقل کی گئی تھی جس کی تفصیل آگے آرہی ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن چند آیتوں کے متعلق زید بن ثابت نے مذکورہ بالا بیان دیا تھا۔ روایت کرنے والے خود اُن آیتوں کی تعیین میں کچھ مبتلائے اشتباہ ہو گئے تھے، بعض تو وہی سورۂ توبہ کا نام لیتے تھے اور بعض کہتے تھے کہ سورۂ احزاب کی رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ الآیۃ والی آیت تھی اور غالب قرینہ یہی ہے کہ برأت ہی والی آیت تھی کیونکہ عام طور پر بطور وظیفہ کے ان ہی دو آیتوں کے پڑھنے کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا اسی لئے ہر خاص و عام کے یاد ہونے کی وجہ سے زیادہ تفتیش و تلاش کی ضرورت بھی نہ تھی، بلکہ روایتوں کے مختلف الفاظ پر اگر

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

بہرحال حکومت کی جانب سے ایک ہی تقطیع کے اوراق پر تمام قرآنی سورتوں کے لکھوانے اور سب کو ایک ہی جلد میں مجلد کرانے کا مرحلہ تو عہدِ صدیقی ہی میں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ایک سال بعد ہی پورا ہو چکا تھا، علامہ قسطلانی شارح بخاری کے حوالہ سے الکتانی نے نقل کیا ہے کہ:

قد کان القرآن کلہ مکتوبًا فی عہدہ صلی اللہ علیہ وسلم لکنّ غیر مجموع فی موضع واحد۔ (ج ۲ ص ۳۸۴ الکتانی)	قرآن کل کا کل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں لکھا جا چکا تھا۔ البتہ ایک جگہ ساری سورتوں کو جمع نہیں کیا گیا تھا (یعنی ایک جلد سازی اور شیرازہ بندی ان سورتوں کی نہیں ہوئی تھی)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۶) غور کیا جائے تو ان سے واقعہ کی اصل صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھوائی ہوئی یادداشتوں میں سے صرف یہی ایک ٹکڑا جس میں توبہ کی یہ دونوں آیتیں تھیں زید کو نہ مل سکا تھا وہ خود فرماتے ہیں کہ وہ ٹکڑا مفقود تھا فَالْتَمَسْنَاهَا فَوَجَدْنَاهَا عِنْدَ خُزَيْمَةَ (پھر ہم لوگوں نے اس کو ڈھونڈھنا شروع کیا تو خزیمہ کے پاس وہی گمشدہ رقعہ یا ٹکڑا مل گیا) بجائے مفرد صیغے کے اِلْتَمَسْتُهَا (میں نے ڈھونڈھا) فَوَجَدْنَاهَا (پھر ہم نے پایا) جمع کا صیغہ حضرت نے جو استعمال کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے صحابی تلاش میں بھی اور اس ٹکڑے کے پانے میں بھی شریک تھے۔ خزیمہ کے پاس یہ رقعہ یا ٹکڑا کیسے پہنچ گیا تھا۔ ممکن ہے کہ نقل کرنے یا کسی دوسری غرض سے رسول اللہ ؐ سے خزیمہ مانگ کر لے گئے اور واپسی سے پہلے آنحضرت ؐ کی وفات ہو گئی یا کسی اور وجہ سے واپس کرنے کا موقعہ ان کو نہ مل سکا۔ ۱۲

حارث محاسبی نے جو امام حنبلؒ کے معاصر ہیں اپنی کتاب فہم السنن میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں قرآن کی یادداشتوں کا جو مجموعہ تھا۔

وَكَانَ الْقُرْاٰنَ فِيْهَا مُنْتَشِرًا فَجَمَعَهَا جَامِعٌ وَرَبَطَهَا بِخَيْطٍ۔ (اتقان ج ۱ ص ۸۳)

اسی میں قرآنی سورتیں الگ الگ لکھی ہوئی تھیں (ابو بکرؓ کے حکم سے جامع (یعنی زید بن ثابت) نے ایک جگہ سب سورتوں کو جمع کیا اور ایک دھاگے سے سب کی شیرازہ بندی کی۔

اور یہی کام یعنی ایک جلد میں مجلد کرانے کا کام عہد صدیقی میں انجام پایا لیکن دوسروں کو بھی اس کی تقلید پر یعنی ساری سورتوں کو ایک ہی تقطیع پر لکھوا کر ایک ہی جلد میں مجلد کرائیں اور سورتوں کی جلد بندی میں جو ترتیب رکھی گئی تھی اس کی پابندی کریں اس پر لوگوں کو مجبور نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ ایک ہی مصنف کی چند کتابوں کو مختلف سائز کے اوراق پر جیسے لوگ چھاپتے ہیں اور کسی خاص ترتیب کی پابندی کے بغیر جس کے جی میں جس طرح آتا ہے ان کی جلد بندھواتا ہے۔ انفرادی آزادیوں کی کچھ یہی صورتِ حال حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت تک قرآنی سورتوں کے متعلق رہی اس انفرادی آزادی میں حکومت نے دخل دینا مناسب خیال نہ کیا۔

عہد عثمانی میں قرآنی خدمت کی نوعیت

لیکن مختلف ممالک و امصار کے لوگ جب اسلام میں داخل ہوئے جن میں عرب ہی نہیں بلکہ بیرونِ عرب کی بھی ایسی بڑی آبادیاں شریک تھیں جن کی مادری زبان عربی نہ تھی، عربی لب و لہجہ کا اختلاف قبائل عرب اور عربی و غیر عربی مسلمانوں میں الفاظ و حروف کے صحیح

تلفظ کی قدرت عموماً ان ہی میں پائی جاتی تھی، نیز خود عرب میں بھی قبائلی اختلاف لب و لہجہ میں بہ کثرت پایا جاتا تھا، اور اختلاف کی یہ نوعیت دنیا کی تمام زبانوں میں عام ہے۔ ابن قتیبہ نے لب و لہجہ کے قبائلی اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ:

فَالْهُذَلِيُّ يَقْرَءُ عَتّٰى	ہذلی یعنی بنی ہذیل کے قبیلہ والے (حتیٰ حین)
عِيْنٍ وَالْاَسَدِيُّ يَقْرَءُ	کو عتیٰ عین پڑھتے ہیں، اسی طرح تعلمون کی
تِعْلَمُوْنَ بِكَسْرِهٖ وَالتَّمِيْمِيُّ	(ت) کو زیر کے ساتھ اسدی یعنی بنی اسد
يَهْمِلُ وَالْقُرَيْشِيُّ	والے تلفظ کرتے ہیں اسی طرح تمیمی اہمال
لَا يَهْمِلُ[1]	سے کام لیتا ہے قریشی یہ نہیں کرتا۔

اسی طرح تابوت کا تلفظ خود مدینہ والے تابوہ کرتے تھے، اور بھی اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔ قرآن کے پڑھنے میں عربی قبائل اور عجمی نومسلموں کی طرف سے ان اختلاف کا جب ظہور ہوا، اور ہر ایک اپنے تلفظ کی صحت پر اصرار بے جا کرنے لگا تو اس وقت حضرت حذیفہ بن یمان صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشورہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس نسخہ کی نقل کرانے کے لیے جو عہد صدیقی میں تیار ہوا تھا۔ حکومت کی طرف سے ایک سررشتہ قائم کر دیا۔ اس سررشتہ کے افسر وہی حضرت زید بن ثابت ہی مقرر کیے گئے جنہوں نے عہد صدیقی میں نسخہ تیار کیا تھا[2]۔ اور مزید گیارہ ارکان کا ان

---

[1] تبیان فی مباحث القرآن، ص ۴۴ صالح الجزائری۔

[2] زید بن ثابت نو عمری میں مسلمان ہوئے تھے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم خصوصیت کے

(باقی صفحہ ۶۰ پر)

کی امداد کے لیے اضافہ کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ کتابت کی حد تک قرآن کو اسی لہجہ اور تلفظ میں لکھا جائے جو رسول اللہ صلعم کا تلفظ اور لہجہ تھا۔ اسی سررشتہ نے صدیقی نسخہ کی چند نقلیں تیار کیں پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک ایک نسخہ سررشتہ کا تیار کیا ہوا مختلف صوبوں کے پایۂ تخت اور چھاؤنیوں میں بھیج کر فرمان جاری کر دیا کہ اپنے اپنے قبائل یا انفرادی لہجوں یا تلفظ کے لحاظ سے لکھے ہوئے قرآنی نسخے لوگوں کے پاس جو موجود ہوں وہ حکومت کے حوالہ کر دیئے جائیں "تاکہ ان نسخوں کو معدوم کر دیا جائے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں قرآن شریف کی خدمت یہی اور صرف یہی ہوئی ہے جو بجائے خود بہت بڑی اور اہم خدمت ہے ورنہ مختلف عربی قبائل اور عجمیوں کے طریقۂ ادا لب ولہجہ کے اختلاف کی بنیاد پر لکھے ہوئے قرآنی نسخے خدانخواستہ اگر دنیا میں پھیل جاتے تو خدا ہی جانتا ہے کہ دشمنانِ اسلام اس بات کو بتنگڑ بنا کر کہاں سے کہاں پہنچا دیتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مسلمانوں پر بہت بڑا احسان ہے کہ لکھاوٹ یعنی نوشت وکتابت کی حد تک انہوں نے قرآن میں وحدت کا رنگ پیدا کر دیا، رہا تلفظ تو ظاہر ہے کہ اس میں وحدت اور یکسانی کا

(بقیہ صفحہ گزشتہ) عالۃ کتابت کا کام ان سے لیا کرتے تھے حتیٰ کہ اسی سلسلہ میں یہودیوں کے اور زبان کی تعلیم بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے انہوں نے حاصل کی تھی، یہ ان صحابیوں میں ہیں جنہوں نے تصنیفی یادگار چھوڑی فرائض ومواریث کے متعلق ان کی ایک کتاب کا ذکر مورخین کرتے ہیں۔ ۱۲ (مناظر احسن گیلانی)

مطالبہ ان کے بس کی بات تھی بھی نہیں اسی لیے اس مطالبہ کو نظر انداز کر دیا گیا اور آزادی بخشی گئی کہ جس کا جو تلفظ ہے یا تلفظ کی جس نوعیت پر جو قادر ہے اسی تلفظ اور لب و لہجہ میں قرآن شریف کو وہ پڑھ سکتا ہے۔ ایک حدیث بھی رسول اللہ صلعم کی موجود تھی جس میں فیصلہ فرما دیا گیا تھا کہ قرآن مجید ایک ہی "حرف" یعنی تلفظ پر نازل نہیں ہوا ہے بلکہ "سبعۃ احرف"[1] یعنی متعدد تلفظ کی اس میں گنجائش ہے۔ اگرچہ کوشش تو اسی کی کرنی چاہیے کہ اسی لب و لہجہ میں قرآن کی تلاوت ہر مسلمان کو میسر ہو جو رسول اکرم صلعم کا لب و لہجہ تھا۔ اسی لیے تجوید اور قرأت کا ایک مستقل فن ابتداء ہی سے مسلمانوں میں مروج ہو گیا اور عبرت کے لیے (یعنی یہ بتانے لیے کہ کوشش کی جائے تو غیر عربی آدمی بھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قریشی لب و لہجہ میں قرآن پڑھ سکتا ہے) قرأت و تجوید کے لئے اسی قسم کے لوگوں کا عہد صحابہ و تابعین ہی میں عموماً انتخاب کیا گیا جو نسلاً عرب نہ تھے فن قرأت کے ائمہ بعد کو بھی عجمی نژاد قاریوں کی جماعت ہوئی۔[2]

---

[1] جس حدیث میں "سبعۃ احرف" کا ذکر آیا ہے جس کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ سات حرفوں پر قرآن نازل ہوا ہے۔ اس کی شرح میں حدیث کے شرح کرنے والوں نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن ارباب تحقیق کا فیصلہ یہی ہے کہ "سبعۃ" یعنی سات کے عدد سے واقعی سات کا عدد مراد نہیں ہے بلکہ اردو میں جیسے بیسیوں کے لفظ سے صرف کثرت مقصود ہوتا ہے یہی حال عربی زبان میں سات کا ہے اور "احرف" یعنی حرفوں سے وہی تلفظ اور لب و لہجہ کا اختلاف مقصود ہے۔ دیکھو طیبی شرح مشکوٰۃ وغیرہ ۱۲۔ [2] اور واقعی اس پر تعجب ہوتا ہے۔

(باقی صفحہ ۶۲ پر)

بہر حال حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ کا کارنامہ قرآن کے متعلق جو کچھ بھی ہے وہ یہی ہے کہ کتابت اور لکھاوٹ کی حد تک تلفظ اور لب و لہجہ کے جھگڑوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا گیا اور یہ کام بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے تقریباً کل چودہ پندرہ سال بعد انجام پایا۔ آج ممکن ہے کہ خلافتِ عثمانی کے عہد کی اس قرآنی خدمت کی قیمت و اہمیت کا لوگوں کو صحیح اندازہ نہ ہو سکے، لیکن ذرا سوچیے تو سہی کہ ابتداء ہی میں مسلمانوں کو کتابت کی اسی ایک شکل پر جمع نہیں کر دیا جاتا تو نتیجہ کیا ہوتا؟

عجمی مسلمانوں کو تو ابھی جانے دیجئے خود عربی قبائل میں تلفظ اور لہجوں کے اختلافات کیا معمولی تھے؟ قرآنی آیت "قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا" کو قبیلۂ قیس والے جو کِ تانیث کا تلفظ شِ سے کرتے تھے ظاہر ہے کہ اس بنیاد پر یہی آیت قیس کے قبیلہ والوں کے قرآن میں اسی شکل لکھی ہوئی ملتی یعنی "قد جعل ربش تحتش سریا" قیس کے اس طرز تلفظ کا اصطلاحی نام کشکشۂ قیس تھا۔ اسی طرح تمیم والے اَنْ کے لفظ کو عَنْ کی شکل میں ادا کرتے تھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۱) کہ قرأ قرآن کے طبقۂ اولیٰ ہی میں ہم قالون اور ورش وغیرہ نام رکھنے والے بزرگوں کو پاتے ہیں۔ ورش تو خیر کہتے ہیں کہ ورشان (فاختہ) کے عربی لفظ کا اختصار لیکن قالون کے متعلق تو اس کی تصریح کی گئی ہے کہ یورپین یعنی رومی لفظ ہے، لکھا ہے کہ عربی میں پہنچ کر صرف اتنا تصرف ہوا کہ کالون کو قالون یعنی کاف کو قاف سے بدل دیا گیا کہتے ہیں کہ کالون کے معنی جید کے ہیں باقی یوں بھی آپ کو قرأ سبعہ جو اس فن کے ائمہ ہیں ان میں زیادہ تر عجمی النسل اور موالی طبقہ سے تعلق رکھنے والے حضرات ملیں گے۔ ۱۲۔ مناظر احسن گیلانی

اس کا نام عنعنہ تمیم تھا مثلاً عَسَی اللّٰہُ اَنْ یَاتِیَ بِالْفَتْحِ کو عَسَی اللّٰہُ عَنْ یَاتِیَ بِالْفَتْحِ کی شکل میں وہ ادا کرتے تھے اور سب سے دلچسپ اس قبیلہ کا تلفظ تھا جو س کے حرف کو ت کی شکل میں ادا کیا کرتا تھا اسی وجہ سے پوری سورۃ والناس کی ہر آیت کے آخری لفظ میں بجائے س کے ان کے قرآن میں ہم گویا ت کو پاتے مثلاً قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاتِ اس معاملے میں لوگ اس درجہ مجبور تھے کہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی اصلاً و نسلاً ہذلی قبیلہ سے تھے ان تک کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس لیے ٹوکا کہ وہ "حتیٰ حین" کا تلفظ "عتیٰ عین" کی شکل میں کر رہے تھے[1]

جب خالص عربی قبائل کا یہ حال تھا تو بے چارے عجمیوں میں پہنچ کر قرآنی نسخوں کی جو حالت ہوتی وہ ظاہر ہے۔ دور کیوں جائیے ہندوستان ہی کا نتیجہ کیا ہوتا۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ اس صورت میں جتنے قرآن پنجاب میں طبع ہوتے ان میں ہر جگہ بجائے "ق" کے "ک" ہی چھاپا جاتا، اسی طرح دکن میں جو قرآن چھپتے "ق" کی جگہ "خ" اور "خ" کی جگہ "ق" لوگوں کو ہر جگہ نظر آتا۔ اور اس قسم کے اختلافات کو کون گن سکتا ہے ہر تھوڑے فاصلے سے تلفظ اور لہجے کے یہ اختلافات زبانوں میں پیدا ہو ہی جاتے ہیں۔

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ

---

[1] قبائل عرب کے لب و لہجہ کے اختلاف کے سلسلے میں جو مثالیں دی گئی ہیں علاوہ دوسری کتابوں کے الجزائری "تبیان" میں بھی اس کا کافی مواد مل سکتا ہے دیکھیے صفحات ۳۷ و ۴۷ وغیرہ۔ ابن مسعودؓ والی روایت کا ذکر بھی اسی کتاب میں کیا ہے۔ ۱۲

مدرسہ کے معلمین جو مختلف لہجوں میں قرآن پڑھاتے ہیں انہی میں کَفَّرَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا[1] کی نوبت تک آگئی تھی تو سمجھا جا سکتا ہے کہ آگے بڑھ کر یہی اختلافات مسلمانوں کو خطرے کے کس نقطہ تک پہنچا دیتے ؟

حضرت عثمانؓ کیا جامع القرآن تھے

واقعہ یہ ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حکومت کی اس عظیم و جلیل خدمت کے مسلمان بہت ممنون نظر آتے ہیں اور عموماً اس کا تذکرہ کرتے ہیں، حتیٰ کہ خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے تھے کہ حضرت عثمان نے بہت اچھا کیا اور جو کچھ کیا ہم سب کے مشورے سے کیا، انہوں نے پوچھا کہ مسلمانوں میں یہ جھگڑا جو چھڑ گیا ہے کہ ہر ایک اپنی قرأت کو دوسروں کی قرأت سے بہتر قرار دیتا ہے بلکہ دوسرے کی قرأت کفر کی حد تک پہنچا دیا جاتا ہے اس کا علاج کیا کیا جائے۔ ہم لوگوں نے پوچھا، آپ نے کیا علاج سوچا ہے۔ عثمانؓ نے کہا۔

أَرَىٰ أَنْ نَجْمَعَ النَّاسَ عَلَىٰ مُصْحَفٍ وَاحِدٍ[2]۔ — میں خیال کرتا ہوں کہ لوگوں کو ایک ہی مصحف پر جمع کر دیا جائے۔

یہی "جَمَعَ النَّاسُ عَلَىٰ مُصْحَفٍ وَاحِدٍ" عہد عثمانی کی قرآنی خدمت کی صحیح تعبیر ہے یعنی مسلمانوں کو ایک ہی مصحف پر آپ نے جمع کر دیا۔ عوام نے ان کے اسی خطابیہ کو جامع القرآن[3] کے نام سے مشہور کر دیا جو نہ صرف یہی کہ واقعہ کی صحیح تعبیر نہیں

---

[1] یعنی بعض بعض کو کافر ٹھہرانے لگے۔ اس کی تفصیل بھی اور کتابوں کے سوا تبیان ہی میں مل سکتی ہے۔

[2] دیکھو مختصر کنز العمال برحاشیہ مسند احمد ج ۲ صفحہ ۵۔ [3] یہ عجیب بات ہے کہ مسلمانوں میں یہ غلط فہمی زمانہ سے پھیلی ہوئی ہے۔ تیسری صدی کے مشہور صوفی اور عالم حارث محاسبی کا

(باقی صفحہ ۶۵ پر)

ہے بلکہ سچی بات یہ ہے کہ عام طور پر اس تعبیر سے بڑی غلط فہمی پھیل گئی لوگ سمجھنے لگے کہ حضرت عثمانؓ سے پہلے گویا قرآن جمع کیا ہوا یا لکھا ہوا نہ تھا اور یہ تو ایک تعبیری غلطی ہے بجائے جامع القرآن کے جامع الناس علی القرآن سے جیسا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا اس کی اصلاح ہو سکتی ہے مگر یہی قصہ یعنی حضرت عثمان کی طرف قرآن کی اسی خدمت کا انتساب اور اس کی شہرت ایک بڑے فتنہ کا مقدمہ بن گئی۔ اور اب ہم اسی فتنہ کے متعلق جیسا کہ مولانا گیلانی نے لکھا ہے کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

ایک بڑے فتنہ کا سدِّ باب بنی امیہ نے اسلامی حکومت پر قبضہ کر کے جب خلافت کو سلطنت کی شکل میں بدل دیا اور روم و ایران کے حکمرانوں کو نمونہ بنا کر حکومت کرنے لگے تو مسلمانوں میں قدرتاً جیسا کہ چاہیے تھا بے چینی پیدا ہوئی اور اس نے ایک عام کشمکش کی شکل حکومت اور عوام کے درمیان پیدا کر دی اس کشمکش کے دبانے کے سلسلہ میں جو بے پناہ مظالم بنی امیہ کے حکمرانوں کی طرف سے مسلمانوں پر توڑے گئے ان کے لئے صرف ایک حجاج ہی کا نام کافی ہو سکتا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۴) یہ قول اتقان میں سیوطی نے نقل کیا ہے المشہور عند الناس ان جامع القرآن (عثمان) ولیس کذالک انما حمل عثمان الناس علی القرأۃ توجہ واحد (لوگوں میں مشہور ہے کہ حضرت عثمان جامع القرآن ہیں حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے انہوں نے لوگوں کو قرآن کی ایک ہی قرأت پر صرف جمع کیا) ص۷۶) اتقان ہی میں ابن التین کا قول نقل کیا ہے کہ صرف قریش کے لغت اور لب لہجہ پر حضرت عثمان نے قرآن لکھوایا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ "قد وسع فی قرأتہ بلغتہ غیرھم رفعاً للحرج" یعنی صرف کتابت کی حد تک قریش کے لب و لہجہ کی پابندی کی گئی باقی پڑھنے میں حضرت عثمان نے بھی اجازت دے رکھی تھی کہ دوسرے لہجہ و تلفظ میں بھی لوگ پڑھ سکتے ہیں اس سے تنگی اور مشقت کا ازالہ مقصود تھا۔ ص۸۵ ۱۲

جس نے ایک لاکھ سے اوپر مسلمانوں کو صبراً (سامنے باندھ کر) قتل کروایا۔ اسی کشمکش کے سلسلہ میں لعنت و ملامت کا قصہ جب دراز ہوا تو بنی امیہ سے آگے بڑھ کر بعض خفیف العقل گرم مزاج لوگوں کی زبانیں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر بھی کھلنے لگیں کیونکہ بنی اُمیہ والے آپ کے نام اور خاندانی تعلق سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے تھے اور مسلمانوں پر احسان جتاتے تھے کہ ہمارے خاندان ہی نے تمہارے قرآن کو محفوظ کر دیا ورنہ تمہارے مذہب کی بُنیاد ہی ختم ہو جاتی اور اشارہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ حکومت کی اسی قرآنی خدمت کی طرف کیا جاتا۔ عبد الملک بن مروان برسرِ منبر مسلمانوں سے کہتا۔

عَلَيْكُمْ بِمُصْحَفِ اِمَامِكُمُ الْمَظْلُوْمِ [1] — مسلمانو! اپنے مظلوم امام و خلیفہ (یعنی عثمانؓ) کے مصحف کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو۔

ظاہر ہے کہ قرآن جو نہ بے چارے حضرت عثمانؓ پر نازل ہوا تھا نہ انہوں نے اس کو ابتداءً لکھوایا تھا، حتیٰ کہ ایک جلد میں تمام سورتوں کو مجلّد کرانے کا کام بھی ان کی حکومت کی طرف سے نہیں انجام پایا تھا۔ البتہ آخر میں بجائے مختلف لہجوں کے کتابت کی حد تک مسلمانوں کو ایک ہی نسخہ پر جمع کرنے کا انتظام اپنی حکومت کی طرف سے کر دیا تھا محض اس لیے اس قرآن کو جس کو اللہ نے نازل کیا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا امام مظلوم کا مصحف

---

[1] طبقات ابن سعد ذکر عبد الملک۔ ۱۲۔

قرآن قرار دینا مسلمانوں کو برہم کر دینے کے لئے کافی تھا ردِّعمل آخر
کا اس شکل میں ہوا کہ حضرت عثمان کی قرآنی خدمت کی اہمیت ہی کو لوگ
نے لگے اور فریقِ مخالف میں جو زیادہ تُندخو، گرم مزاج تھے وہ حضرت
ن پر اُلٹ کر طرح طرح کے الزامات بھی تھوپنے لگے اور جو قرآن خالقِ عالم
نے سے آخری پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سارے جہان
انسانوں کے لیے اُترا تھا اس کا نام ہی ان لوگوں نے "بیاضِ عثمانی"
ذ باللہ رکھ دیا جو "مصحفِ امام مظلوم" کے کلوخ کی پاداش بہ شکلِ سنگ"
سچ پوچھیے تو بنی امیہ کے اسی طرزِ عمل کی مخالفت میں بعض ناعاقبت اندیش
ں نے مسلمانوں میں جعلی بے سروپا روایتیں خود ہی گھڑ گھڑ کر پھیلا دیں
ان میں جو زیادہ چالاک تھے، جانتے تھے کہ جعلی روایتوں کا پردہ بآسانی
ہوجائے گا۔ انہوں نے بعض صحیح اور ثابت روایتوں کو غلط مقصد کے لئے
عمال کیا ان لوگوں کی یہ دوسری تدبیر زیادہ کارگر ثابت ہوئی اچھے اچھے
ان مغالطوں کے شکار ہو گئے۔ اس سلسلہ میں مولانا گیلانی نے جو کچھ ارقام
ہے اس کا خلاصہ درج کرتا ہوں۔

سہولت کے لیے روایات کے اس ذخیرہ کو دو حصوں پر تقسیم کر دیا جاتا
ایک حصہ تو ان خود تراشیدہ فرضی روایات کا ہے مولانا نے جن کی تعبیر
کات کے لفظ سے کی ہے، کیونکہ ان کو سن کر کوئی شخص اپنی ہنسی
ں ہی سے ضبط کر سکتا ہے اور جن صحیح روایات سے ناجائز نفع اٹھاتے
گے مغالطہ دینے کی کوشش کی گئی ان کے لیے "مغالطات" کا عنوان

قائم کیا جائے گا۔

مضحکات | ۱۔ کہا جاتا ہے کہ قرآنی آیت قِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَسْئُوْلُوْنَ۔ آخر میں عَنْ وِلَایَةِ عَلِیٍّ کے الفاظ تھے جنہیں عہد عثمانی میں قصداً سے خارج کر دیا گیا یعنی قرآن میں یہ لکھا ہوا تھا کہ میدانِ حشر میں لوگوں کو کر کے علی کی ولایت کے متعلق پوچھا جائے گا۔

۲۔ اسی طرح کوئی صاحب محمد بن جہم الہلالی تھے، امام جعفر صا علیہ السلام کی طرف منسوب کر کے انہوں نے یہ مشہور کیا کہ قرآنی آیت اَ هِیَ اَرْبٰی مِنْ اُمَّةٍ میں تحریف کی گئی ہے اصلی الفاظ اَئِمَّتُنَا هِیَ اَزْکیٰ مِنْ اَئِمَّتِکُمْ[1] تھے۔

۳۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ قرآن میں قبیلۂ قریش کے ستّر نام نسب موجود تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سب کو ساقط فرما دیا۔

۴۔ اسی طرح "کَفَی اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ الْقِتَالَ" کی آیت میں کہتے علی بن طالب کے الفاظ بھی تھے۔[2] اسی قسم کی بیسیوں[3] خرافات اس طر طرف سے پھیلائی گئیں۔ اگر مسلمانوں کے پاس روایتوں کے جانچنے کا طریقہ راویوں کی تحقیق کے متعلق نہ ہوتا تو ان جھوٹی قطعاً جعلی روا متعلق بے بنیاد اور محض گپ ہونے کا فیصلہ آسان نہ ہوتا۔ ان لوگ

---

[1] ہمارے بنی ہاشم کے ائمہ و حکمران بنی امیہ کے حکمرانوں سے بہتر ہیں۔ ۱۲۔

[2] جس کا مطلب یہ ہوا کہ جنگ کے لیے خدا اور علی مسلمانوں کی طرف سے کافی ہو

[3] یہ سارے مضحکات آپ کو تفسیر روح المعانی کے مقدمہ صـ۲۳ میں مل سکتے ہیں۔ ۱۲۔

ردی کہ الفاظ ہی نہیں بلکہ کہتے ہیں کہ سورۂ ولایت کے نام سے ایک
مل سورۃ ہی قرآن میں تھی جس میں اہل بیت کے اسماء اور ان کے حقوق
کا تفصیلی ذکر تھا۔ حضرت عثمان نے اس پوری سورت ہی کو حذف کردیا
ل اس شیعی عالم نے جس کا پہلے بھی میں نے ذکر کیا ہے یعنی علامہ طبرسی
ن ساری گپوں پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے۔

اَلزِّيَادَةُ فِي الْقُرْاٰنِ	قرآن میں (غیر قرآنی عنصر کا) اضافہ یہ مسئلہ
مُجْمَعٌ عَلَيْهِ بُطْلَانُهَا	تو اجماعی واتفاقی ہے (شیعوں اور سنیوں
وَاَمَّا النُّقْصَانُ فَقَدْ	دونوں کا) کہ ایسا نہیں ہوا۔ باقی کمی
رُوِيَ عَنْ قَوْمٍ مِنْ	(یعنی قرآن کی کچھ آیتیں حذف ہوگئیں)
اَصْحَابِنَا وَعَنْ قَوْمٍ	سو ہمارے یہاں کے بعض لوگ
مِنْ حَشَوِيَّةِ الْعَامَّةِ	(یعنی بعض شیعی مسلک رکھنے والے) اور
وَالصَّحِيْحُ خِلَافُ	عامہ یعنی سنیوں کے بعض حشو یہ سے
ذٰلِكَ۔	اس کا دعویٰ منقول ہے لیکن صحیح یہی ہے

کہ یہ بھی غلط ہے۔

میں عرض کرچکا ہوں کہ "اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ" کی ذمہ داری جب خود خدا
ہے اور بالاتفاق شیعہ وسنی دونوں کے نزدیک یہ قرآن کی آیت
۔ قرآن سے کسی چیز کے نکل جانے کے دعوے کے بعد آدمی مسلمان
ب باقی رہتا ہے۔ بقول شیعی عالم علامہ طبرسی تو انزد تواترت کی جس راہ سے

یعنی ہم ہی پر ہے قرآن کا جمع کرنا۔ ۱۲۔

قرآن مجید منتقل ہوتا ہوا چلا آرہا ہے اس کا مقابلہ بھلا بہ خود تراشیدہ
افسانے کہاں تک کر سکتے ہیں۔

مغالطات | رہا روایتوں کا دوسرا حصہ جنہیں مولانا گیلانی نے مغا...
کا نام دیا ہے۔ دراصل انہی کی طرف طبرسی نے اشارہ کرتے ہوئے...
کہ عامہ کے حشویہ یعنی اہلِ سنت کے محدثین میں بھی نقص کی بعض ر...
پائی جاتی ہیں، یعنی اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی بعض آیتیں ج...
قرآن میں شریک تھیں بعد کو حذف ہو گئیں لیکن ابھی آپ کو معلوم ہ...
بجائے خود یہ روایتیں غلط نہیں ہیں بلکہ ان سے جو نتیجہ پیدا کیا گیا و...
یا کم از کم غلط فہمی پر ضرور مبنی ہے۔ بقدر ضرورت ان میں جو چیزیں قابل...
ہیں ان کا قصّہ بھی سُن لیجئے۔

اس سلسلہ میں مختلف نوعیت کی روایتیں ہیں۔ مثلاً

(۱) بعض روایتوں میں کسی غیر قرآنی حکم کا ذکر کرتے ہوئے
الفاظ یعنی،

فِی مَا اُنْزِلَ مِنَ الْقُرْاٰنِ۔ — یہ اسی سلسلہ اور راہ کی چیز ہے ج... سے قرآن نازل ہوا۔

حدیث رضاعت | جیسے الفاظ راوی نے بڑھا دیئے ہیں اس کی مثا...
والی روایت جو عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے...
کے یہ ہیں، یعنی وہ فرماتی تھیں کہ

فِیمَا اُنْزِلَ مِنَ الْقُرْاٰنِ — ان ہی باتوں میں جو اسی راہ...

عشر رضاعات معلومات	نازل ہوئی ہیں جس راہ سے قرآن نازل
یحرمن ثم ینسخن	ہوا یہ حکم بھی تھا کہ دس گھونٹ یا دس
بخمس معلومات	دفعہ پینا حرام کر دیا ہے پھر منسوخ ہو گیا
فتوفی صلے اللہ علیہ	یہ حکم " پانچ مقررہ گھونٹ سے " اور
وسلم وھی فیما یقرء	وفات پا گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ
من القرآن ۔	وسلم اور یہ حکم ان ہی باتوں میں شریک
	تھا جن میں قرآنی حکم شریک ہیں ۔

واقعہ یہ ہے کہ بجز بخاری کے صحاح ستہ کی عام کتابوں میں یہ روایت پائی جاتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ فی ما انزل من القرآن یا فی ما یقرء من القرآن کے الفاظ سے یہ کیسے سمجھ لیا گیا کہ یہ قرآن کے اجزا تھے ۔ تفصیل کے لیے تو مولانا گیلانی کی اصل کتاب کا مطالعہ مناسب ہو گا ۔ یہاں اسی کتاب سے اخذ کر کے بقدر ضرورت بحث کی جاتی ہے ۔

آخر اتنی بات سے تو ہر پڑھا لکھا مسلمان واقف ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو احکام و قوانین امت کو عطا کیے جاتے تھے اُن میں ایک سلسلہ تو اُن احکام کا تھا جن کی تعلیم حق تعالیٰ کی طرف سے جبریلؑ آنحضرت صلعم کو دیا کرتے تھے اور دوسرا سلسلہ احکام ہی کا ایسا بھی تھا جن میں پیغمبر خود اپنے اجتہاد سے کام لیتے تھے ، اگرچہ " اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی " کے لحاظ سے ہم دونوں کو وحی ہی سمجھتے ہیں ۔ بہر حال ظاہر ہے کہ وحی کا وہ سلسلہ جو جبریلِ امین کی راہ سے جاری تھا وہ اپنی الگ نوعیت رکھتا

تھا۔ پھر جبریل امین کی راہ سے جو چیزیں آرہی تھیں ہر ایک جانتا ہے کہ ان کی بھی دو قسمیں تھیں، یعنی ایک تو قرآن اور قرآنی آیات کا سلسلہ اور دوسرا سلسلہ جبریل امین ہی کے ذریعہ سے وہ بھی جاری تھا جو قرآن کا جز نہیں بنتا تھا گویا منطقی طور پر یوں کہہ لیجئے کہ قرآن تو وہ ہے جو جبریل کے ذریعہ نازل ہوا لیکن ہر وہ چیز جو جبریل کے ذریعہ سے نازل ہوتی تھی اس کا قرآن ہونا ضروری نہ تھا آخر ایمان، اسلام واحسان کے متعلق سوال و جواب کا جو قصہ بخاری میں ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کے متعلق فرمایا کہ:

اَتَاکُمْ جِبْرِئِیْلُ — تمہارے پاس جبریل آئے تھے تم کو

یُعَلِّمُکُمْ دِیْنَکُمْ — تمہارا دین سکھانے کے لیے۔

ظاہر ہے کہ جبرئیل نے اس وقت دین کے متعلق جو کچھ سکھلایا تھا یقیناً وہ قرآن میں شریک نہیں کیا گیا اور یہی ایک روایت کیا اکثر چیزیں اسی قسم کی بتوسط جبرئیل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئیں لیکن وہ قرآن میں شریک ہونے کے لیے نازل نہیں ہوئی تھیں اسی لیے قرآن میں شریک نہیں کی گئیں۔

اسی بنیاد پر فِیْ مَا اُنْزِلَ فِی الْقُرْاٰنِ سے راوی کا مقصد یہ ہے کہ یہ مسئلہ آنحضرت صلعم کے اجتہادی مسائل میں سے نہ تھا بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ جس راہ سے قرآن نازل ہوا ہے اسی راستہ سے یہ حکم بھی اللہ تعالیٰ کے رسول تک پہنچا تھا۔ اور یہ کہ قرآن کو جس راہ کی چیز سمجھ کر پڑھا جاتا ہے

اسی راہ کی چیز یہ بھی ہے اور یہی معنی ہیں فِیْمَا یُقْرَءُ مِنَ الْقُرْاٰنِ کے یعنی جو کچھ قرآن میں پڑھا جاتا ہے جس راہ سے وہ آیا اُسی راہ کی چیز یہ بھی ہے۔

رجم کی روایت | اس سلسلہ میں سب سے زیادہ دلچسپ وہ روایت ہے جس میں رجم کا ذکر ہے یعنی شادی شدہ آدمی سے زنا کا صدور جب ہو تو سنگساری کا حکم اسلام میں جو دیا گیا ہے اس کے متعلق بخاری شریف میں ایک طویل حدیث اس سلسلہ میں پائی جاتی ہے حاصل جس کا یہ ہے کہ حج کے موسم میں حضرت عمرؓ کو اس کی خبر ملی کہ بعض لوگ ان کی وفات کے بعد خلافت کے متعلق کچھ منصوبے پہلے سے پکا رہے ہیں اور حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب پر کچھ اعتراض بھی کرتے ہیں حضرت عمرؓ نے پہلے تو چاہا کہ حج ہی کے موقع پر ایک تقریر کریں، لیکن بعد کو رائے بدل گئی اور مدینے پہنچ کر آپ نے جمعہ کے خطبہ میں ان ہی باتوں کا ذکر فرمایا جن کا تذکرہ حج کے موقع پر کرنا چاہتے تھے، یہ بڑی طویل تقریر ہے جس میں بہت سی باتیں بیان کی گئی ہیں اسی میں ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کا ذکر آپ نے فرمایا اور مسلمانوں کو اس کی وصیت کرتے ہوئے کہ میرا کیا ٹھکانہ ہے آج ہوں کل نہ ہوں اس لیے چند ضروری باتوں کا اظہار ضروری خیال کرتا ہوں۔ اسی سلسلہ میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ رجم کا قانون اگرچہ قرآن میں نہیں پایا جاتا مگر میں گواہی دیتا ہوں کہ

كَانَ مِمَّا	یہ قانون بھی ان ہی باتوں میں سے ہے
اَنْزَلَ اللّٰهُ	جنہیں اللہ نے نازل فرمایا۔

پھر یہ بھی فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قانون کو ہم نے سیکھا

پڑھا، اور یاد کیا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل بھی کیا اور آپ کے بعد ہم نے بھی رجم کیا۔ اسی کے بعد آپ نے زور دے کر کہا کہ قرآن میں نہ ہونے کی وجہ سے کسی کو یہ مغالطہ نہ ہو کہ یہ خدا کے نازل فرمودہ قوانین میں نہیں ہے بلکہ یہ خدا ہی کا برحق اور اسی کا واجب کیا ہوا قانون ہے۔ آخر میں فرمایا کہ بس چاہیے کہ مرد ہوں یا عورت شادی شدہ ہونے کے بعد جو بھی زنا کا ارتکاب کرے اور ثابت ہو جائے تو اس کو رجم (سنگسار) کیا جائے

یہ عجیب بات ہے کہ اسی کے بعد آپ نے یہ بھی فرمایا کہ :-

إِنَّا كُنَّا نَقْرَءُ فِيمَا نَقْرَءُ مِنْ كِتَابِ اللَّهِ أَنْ لَّا تَرْغَبُوا عَنْ آبَائِكُمْ فَإِنَّهُ كُفْرٌ لَكُمْ أَنْ تَرْغَبُوا عَنْ آبَائِكُمْ۔	جس راہ کی چیز سمجھ کر کتاب اللہ (قرآن) کو ہم پڑھتے تھے کہ اپنے باپوں سے اعراض نہ کرو، کیونکہ اپنے باپوں سے اعراض تمہارے لیے کفر ہے۔

پھر آپ نے یہ بھی فرمایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی منع فرمایا ہے کہ جیسے عیسائی حضرت عیسیٰ کی تعریف میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں اور حد سے تجاوز کر جاتے ہیں تم بھی میری تعریف میں اس قسم کے اطراء وغلو سے کام نہ لینا۔

میں نے اس دوسری بات کو عجیب بات اس لیے کہا کہ رجم کے متعلق تو صرف مِمَّا أَنْزَلَ اللَّهُ حضرت عمرؓ نے کہا تھا مگر یہ کہ باپوں سے اعراض کرنے کے متعلق جو الفاظ آپ نے فرمائے اس میں تو كُنَّا نَقْرَءُ فِيمَا نقرء

مِنْ کِتَابِ اللّٰہِ کے الفاظ ہیں لیکن ان الفاظ کے متعلق مسلمانوں میں کسی کا کسی زمانہ میں کسی نے بھی چرچا نہ کیا جیسا کہ رجم والے الفاظ کے متعلق پھیلا دیا گیا کہ پہلے وہ قرآن میں موجود تھے اور طرفہ تماشا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن سے الفاظ تو خارج کر دیئے گئے لیکن قانون کو جیسا کہ سب جانتے ہیں۔ قیامت تک کے لیئے باقی رکھا گیا اور لبس کرنے والوں نے اسی پر لبس نہیں کیا بلکہ الفاظ کا ایک مجموعہ بھی بنا لیا گیا جو مدرسوں میں آج تک مشہور ہے کہا جاتا ہے کہ قرآن میں قانون رجم کے متعلق یہی الفاظ تھے الفاظ کا وہ مجموعہ یہ ہے۔

اَلشَّیْخُ وَالشَّیْخَۃُ کوئی بڈھا اور بڈھی جب زنا کریں

اِذَا زَنَیَا فَارْجُمُوْھُمَا تو دونوں کو سنگسار کر دو۔

بعضوں میں "البتہ" کے لفظ کا اضافہ بھی پایا جاتا ہے۔ بہر حال صحیحین (بخاری و مسلم) میں یہ الشیخ والشیخۃ والی روایت نہیں پائی جاتی بلکہ ابو داؤد، ترمذی وغیرہ میں بھی نہیں ہے ماسوا اس کے اس روایت کے راویوں کی حالت کیا ہے اس سے اگر قطع نظر بھی کر لیا جائے پھر بھی بقول مولانا گیلانی اس کو قرآن مجید کا گویا معجزہ ہی خیال کرنا چاہیے کہ روایت کے الفاظ ہی سے اس قانون کی تردید ہو جاتی ہے جس کے لیے بنانے والوں نے ان عجیب و غریب الفاظ کے مجموعہ کو بنایا ہے آپ سن چکے اور دنیا جانتی ہے حضرت عمرؓ کے الفاظ ابھی گزرے ہیں کہ رجم کا قانون شادی شدہ مردوں اور عورتوں کے لیے ہی ہے" مگر اب ذرا روایت کے ان الفاظ پر غور کیجئے

ل یعنی ہم پڑھتے تھے اس کو اسی سلسلہ میں جس سلسلہ میں قرآن پڑھتے ہیں۔ ۱۲-

اَلشَّیْخُ (بڈھا) اَلشَّیْخَۃُ (بڈھی) ایسے الفاظ ہیں جن کے لیے ضروری نہیں کہ وہ شادی شدہ ہوں، پھر نتیجہ کیا ہوا ایسے بڈھے اور بڈھی عورت جن کی شادی نہیں ہوئی ہو ان الفاظ کی بنیاد پر چاہیے کہ ارتکابِ گناہ کے جرم میں سنگسار کر دیئے جائیں اور جوان مرد اور جوان عورت شادی شدہ ہی کیوں نہ ہوں چونکہ الشیخ اور الشیخہ کے الفاظ ان پر صادق نہیں آتے اس لیے رجم کا قانون ان کے لیے باقی نہ رہا اور یہی کیا رجم کا قانون اس روایت کی بناء پر صرف اسی زنا سے متعلق ہو گا جب بڈھے اور بڈھی ہوں لیکن ایک طرف بڈھا اور دوسری طرف جوان یا بالعکس ہو تو اس پر بھی یہ قانون عائد نہ ہو گا اور سچی بات تو یہ ہے کہ شیخوخت عربی زبان میں عمر کے جس حصہ کی تعبیر ہے یہ عمر کا وہ زمانہ ہے جس میں عموماً جنسی خواہش کا زور کم کیا بلکہ بسا اوقات مفقود بلکہ حد نفرت کو بھی پہنچ جاتا ہے۔ جوان عورت کے ساتھ تو ممکن ہے کوئی بڈھا مشغول ہو جائے یا بالعکس میں بھی امکان ہے مگر جب دونوں پھوس بوڑھے ہوں یعنی الشیخ والشیخہ بن چکے ہوں تو زنا کے صدور کا امکان ہی کیا باقی رہتا ہے۔ پس مطلب یہ ہوا کہ سرے سے رجم کا قانون ہی غیر عملی بن کر ان الفاظ کی بنیاد پر رہ جاتا ہے۔ کیا تماشا ہے کہ رجم کے قانون کو ثابت کرنے کے لئے ایسے الفاظ کا انتخاب کیا گیا جس سے اس قانون کی بنیاد ہی منہدم ہو کر رہ گئی، کیسی عجیب بات ہے۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی قانون رجم کا ذکر فرماتے ہوئے صاف صاف لفظوں میں فرماتے تھے کہ قرآن میں اس کو داخل کر کے،

اِنْ اَزِيْدَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ میں اللہ کی کتاب میں اضافہ کرنے کا فعل کروں گا۔
اسی کے ساتھ یہ بھی فرماتے کہ اس کا خطرہ اگر نہ ہوتا تو قانون کی اہمیت کا
تقاضا تھا کہ قرآن کے کم از کم حاشیے پر اس کو لکھ دیا جاتا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ
جس کے متعلق کہہ رہے ہوں کہ قرآن میں اس کے داخل کرنے سے اضافہ
ہوگا، یعنی جو چیز قرآن کا جزو نہیں ہے وہ قرآن کا جزو بن جائے گی مگر لوگ ہیں
کہ یہی کہتے جا رہے ہیں کہ قرآن ہی کا جزو رجم کا قانون تھا[ل]، اور مغالطہ کس سے ہوا؟

ل حقیقت یہ ہے کہ جلد (تازیانہ) کی قرآنی سزا جرم زنا کے متعلق قرآن میں نازل ہو چکی تھی
اور اسی بنا پر آدمی کنوارا (غیر محصن) ہی کیوں نہ ہو اگر زنا کا مجرم ہوگا تو جلد (تازیانے)
کی سزا کا مستحق وہ ہو جاتا ہے مگر قدرتاً یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شادی شدہ
یعنی محصن زنا سے بچانے والی چیز یعنی بیوی رکھتے ہوئے بھی اس جرم کا اگر مجرم ہو
تو اس کا جرم اس کنوارے سے یقیناً زیادہ سخت ہے جو اپنی جنسی خواہش کی تکمیل کے ذریعہ
(بیوی) سے محروم ہے گویا شادی شدہ (محصن) صرف زنا ہی نہیں بلکہ اس سے بھی
زیادہ شرارت کا مرتکب ہے، اسی لیے صرف زنا کی جو سزا ہے یعنی تازیانے کی سزا سے
زیادہ سخت سزا کا طالب خود اس کا جرم ہے زنا کے جرم سے زیادہ شادی شدہ آدمی
کے اندر جو شرارت اور بیباکی کی کیفیت پائی جاتی ہے اسی کا اقتضا یہ ہوا کہ اس کی سزا
میں بھی سختی کا اضافہ کر دیا جائے۔ رجم اس قدرتی اقتضار کی تکمیل سے ہے۔ اسی لیے حضرت
علی کرم اللہ وجہہ بھی جیسا کہ بخاری میں ہے فرمایا کرتے تھے کہ "رجمتها بسنة رسول الله"
(یعنی محصن کی سزا رجم جو میں نے دی تو یہ رسول اللہ ﷺ کی سنت کی بنیاد پر دی) جس کا مطلب یہی
ہوا کہ کسی قرآنی قانون پر اس سزا کی بنیاد قائم نہیں ہے، رہا یہ کہ قرآن میں خالص زنا ہی

(باقی صفحہ ۷۸ پر)

صرف کان مما انزل اللہ کے الفاظ سے ہوا۔ مگر آپ دیکھ چکے کہ ان الفاظ کا مطلب یہ قطعاً نہیں ہے۔ آخر اسی روایت میں تو رغبۃ عن الآباء والے حکم کو بھی تو حضرت عمرؓ ہی نے اس سے بھی زیادہ تیز تر الفاظ یعنی کنا نقرء فیما نقرء من کتاب اللہ کے ذریعہ اپنے مطلب کو ادا کیا ہے لیکن اس کا چرچا لوگوں میں کیوں نہیں پھیلا، بڑے بڑے مولوی بھی شاید اس کا استحضار نہ رکھتے ہوں حالانکہ اس قسم کے الفاظ کا مطلب جو کچھ ہوتا ہے حضرت عمرؓ کے بیان کے اسی حصہ سے چاہیے تھا کہ لوگ سمجھ لیتے، مگر سمجھنے کا جب ارادہ ہی نہ کیا جائے تو اس کا کیا علاج ہے، یہی روایت کیا بلکہ بیر معونہ میں حفاظ قرآن کی کافی تعداد دھوکہ سے جو شہید ہوئی تھی، حدیثوں میں اس قصہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت انسؓ فرمایا کرتے تھے کہ یہ بیچارے بحالت غربت جو شہید ہوئے تو،

فَاَخْبَرَ جِبْرَئِیْلُ عَلَیْہِ السَّلَامُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّھُمْ لَقُوْا رَبَّھُمْ فَرَضِیَ عَنْھُمْ وَ اَرْضَاھُمْ۔	جبرئیل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ حفاظ قرآن کی یہ جماعت اپنے پروردگار سے جا کر مل گئی پس اللہ ان سے راضی ہوا اور ان لوگوں کو خدا نے خوش کر دیا۔

روایت کے بعض الفاظ میں ہے کہ خود ان شہید ہونے والے حفاظ نے اللہ تعالیٰ سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۷) کا حکم کیوں اُترا، اور زنا کے جرم میں احصان کی وجہ سے جو سختی بڑھ جاتی ہے اس حکم کو رسول اللہ کی سنت کے سپرد کیوں کر دیا گیا قانونی نزاکتوں سے جو واقف ہیں اس کی مصلحت کو سمجھ سکتے ہیں جس کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔ ۱۲۔

یہ دعا قتل ہونے سے پہلے کی تھی کہ:

اَللّٰھُمَّ اَبْلِغْ عَنَّا نَبِیَّنَا	اے اللہ ہمارے نبی کو مطلع کر دیجئے کہ آپ سے
اِنَّا قَدْ لَقِیْنَا فَرَضِیْنَا	ہم مل گئے پس ہم آپ سے راضی اور خوش ہوئے
عَنْکَ وَرَضِیْتَ عَنَّا	اور آپ ہم سے راضی اور خوش ہوئے۔

اس روایت کا ذکر کرکے حضرت انسؓ کہا کرتے تھے کہ ہم الفاظ کو یعنی ان شہداء کی دعا، کے ان الفاظ کو جن کی خبر جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ رسول اللہ کو ملی تھی کنا نقرء یعنی پڑھا کرتے تھے پس نقرء کے لفظ سے بعضوں کو مغالطہ ہوا کہ شاید یہ بھی قرآن کا جزء تھا، حالانکہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس کی نوعیت بھی وہی فِیْمَا اُنْزِلَ مِنَ الْقُرْاٰن یا کُنَّا نَقْرَءُ فِیْمَا نَقْرَءُ مِنْ کِتَابِ اللّٰہِ کی ہے یعنی جبرئیل علیہ السلام کے توسط سے رسول اللہ تک یہ پہنچا تھا۔ اور معلوم ہو چکا کہ قرآن کی وحی میں تو جبرئیل علیہ السلام ضرور واسطہ کا کام کرتے تھے لیکن ہر وہ چیز جو جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ رسول اللہ تک پہنچی تھی اس کا قرآن ہونا ضروری نہ تھا اور یہی صورتحال ان الفاظ کی ہے۔

(۲) مغالطات کے سلسلہ میں میرے نزدیک ایسی روایتیں بھی شامل ہیں جن میں صحابی نے کسی قرآنی آیت کا مضمون اور مطلب اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے قرآن کی طرف اس مطلب کو منسوب کر دیا ہے۔ ہم لوگ یعنی جن کی مادری زبان عربی نہیں ہے اردو میں قرآنی آیتوں کا مطلب بیان کرتے ہیں، لیکن صحابہ ظاہر ہے کہ مطلب و معانی کو بھی عربی زبان ہی میں ادا کرتے تھے، بعضوں کو اسی سے مغالطہ ہو گیا کہ صحابہ کے بیان کردہ

یہ تفسیری و تشریحی الفاظ بھی قرآن کے اجزاء تھے اس کی ایک اچھی مثال یہ روایت ہے یعنی ایک صحابی نے بیان کیا کہ قرآن میں مَیں نے پڑھا ہے کہ:

لوکان لابن آدم وادیا	یعنی آدم کے بچے کے پاس ایک وادی برابر
من مال لا ابتغی الیہ ثانیا	مال ہو تو چاہے گا کہ دوسری وادی بھر بھی مال
الحدیث۔	اس کو مل جائے آخر حدیث تک۔

اس میں شک نہیں کہ بجنسہٖ یہ الفاظ قرآن میں نہیں ہیں لیکن،

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا قطعاً انسان بڑا بے صبرا پیدا کیا گیا ہے[1]۔

قرآن کی مشہور آیت ہے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ ھلوع کا مطلب وہی ہے جسے صحابی نے مذکورہ بالا الفاظ میں ادا کیا پھر اسی مضمون کو انہوں نے قرآن کی طرف منسوب کر کے اگر بیان کیا تو اس سے یہ کیسے سمجھ لیا گیا کہ ان کا خیال یہ تھا کہ بجنسہٖ یہی الفاظ قرآن میں پائے جاتے ہیں آخر روزمرہ کی یہ بات ہے کہ عام گفتگو میں، وعظوں میں، تقریروں میں لوگ مضمون بیان کر کے کہتے ہیں کہ ایسا قرآن میں آیا ہے لیکن یہ کتنی بڑی حماقت ہو گی اگر سننے والا قرآنی آیت کے حاصل مطلب کے بجنسہٖ ان ہی الفاظ کو قرآن میں تلاش کرنے لگے

---

[1] حقیقت یہ ہے کہ "ھلوع" کا عربی لفظ جن مطالب پر مشتمل ہے "بے صبرا" کے لفظ سے وہ صحیح طور پر ادا نہیں ہوتا جب تک سطر دو سطر میں اس کی تشریح نہ کی جائے۔ اس موقعہ پر ایک لطیفہ کا خیال آیا کہ مولوی خرم علی ملہوری مرحوم کا ایک مشہور شعر ہے کہ:

خدا فرما چکا قرآں کے اندر — مرے محتاج ہیں پیر و پیمبر

ایک فقیر اسی شعر کو گا گا کر بھیک مانگ رہا تھا جو وہابیوں سے بہت برہم رہتے تھے بولے کہ

(باقی صفحہ ۸۱ پر)

(۴) مغالطہ کی اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ قرآن سناتے ہوئے بعض دفعہ صحابی بیچ میں تفسیر طلب الفاظ کی تفسیر بھی کرتے چلے جاتے تھے، ہندوستانی علماء بھی بکثرت اس کام کو کرتے ہیں لیکن چونکہ ان کے تفسیری الفاظ اُردو میں ہوتے ہیں اس لیے سب جانتے ہیں کہ درمیان کے الفاظ قرآنی الفاظ کی تفسیر سے تعلق رکھتے ہیں لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا صحابہ کی مادری زبان بھی چونکہ وہی تھی جو قرآن کی زبان ہے اسی سے بعضوں نے تفسیر کے ان عربی الفاظ سے یہ غلط نفع اٹھانا چاہا اور مشہور کر دیا کہ فلاں سورۃ میں موجودہ الفاظ کے ساتھ فلاں فلاں الفاظ پائے جاتے تھے جو اب قرآن سے خارج ہو گئے ہیں حضرت ابی بن کعب صحابی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے ساتھ یہی صورت پیش آئی یعنی وہ سورۃ "البینہ" سُنا رہے تھے، جب قرآن کے الفاظ

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ

اور نہیں حکم دیا (ان کو) لیکن صرف اس کا کہ پوجے چلے جائیں اللہ کو دین کو اسی کے لیے خالص بنا کر بالکلیہ اسی کی طرف جھکتے ہوئے۔

پر پہنچے تو "مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ" یعنی دین کو اللہ کے لئے خالص بنانے کا مطلب کیا ہے اسی کو سمجھانے لگے جس کا حاصل یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی مبارک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۰) قرآن میں یہ کہاں ہے۔ میں نے عرض کیا کہ کہاں یٰاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ اِلَی اللّٰهِ (اے انسانو! تم سب اللہ کے محتاج ہو) اس کا مطلب یہی تو ہے مگر وہ یہی کہتے رہے کہ "مرے محتاج ہیں پیر و پیمبر" ان الفاظ کو قرآن میں بتاؤ۔ ۱۲۔ مناظر احسن

مبارک اور اس کی خوشنودی کا حاصل کرنا ہی الدین اور مذہب کی خالص رُوح اور خالص منشا ہے۔ باقی بعض لوگ جیسے رنگ، نسل، وطن زبان وغیرہ کو فرقہ داری دھڑا بندیوں کا آلہ بنا لیتے ہیں اسی طرح ایک طریقہ تقسیم کا کبھی دین اور مذہب کو بھی بنا لیا جاتا ہے اس وقت بجائے رضاء حق کے جتھا بندی کا محض ایک ذریعہ بن کر مذہب رہ جاتا ہے۔ اس زمانہ میں یہودیت، نصرانیت، مجوسیت وغیرہ مذاہب مرضی حق تک پہنچنے کے نہیں بلکہ قومی عصبیت کے اُبھارنے کے ذرائع بنے ہوئے تھے۔ اسی توضیحی و تفسیری مطلب کو عربی زبان میں حضرت ابی بن کعب نے ان الفاظ میں ادا کیا کہ:

الله الحنيفة المسلمة لا اليهودية ولا النصرانية ولا المجوسية

دین خدا کے نزدیک وہی معتبر ہے جس میں حنیفیت (یعنی خدا کی طرف یکسوئی کی گئی ہو جو حنفاء کا مطلب ہے) اور مسلمہ ہو (یعنی اپنے آپ کو بالکلیہ خدا کے سپرد کر دیا جائے) نہ یہودیت نہ نصرانیت نہ مجوسیت (یعنی ان دینی ناموں کو انسانیت کی تقسیم کا ذریعہ بنانا) یہ ان لوگوں کا کام نہیں ہو سکتا جو اپنے دین کو واقعی صرف خدا کے لیے خالص بنانا چاہتے ہیں یا مخلص ہو کر دینی زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔

مُسند احمد کے حوالے سے جمع الفوائد میں نقل کیا ہے کہ ان الفاظ کے بعد ثم ختم بما بقی من السورۃ۔ پھر اُبی نے (ان الفاظ کے) بعد سورہ البینہ کو ختم کیا۔ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ درمیان کے تفسیری الفاظ کو فرمانے کے بعد حضرت ابی بن کعب نے سورہ کو ختم کیا۔ واقعہ کی صورت کل یہی ہے۔ آپ ہی بتائیے کہ مغلطے کے سوا اس کو اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اگر حضرت ابی کے ان

تفسیری الفاظ کے متعلق محض اس لیے کہ وہ عربی زبان کے الفاظ ہیں یہ وسوسہ دلوں میں کوئی ڈالے کہ ابی بن کعب کے نزدیک قرآن ہی کے اجزا (العیاذ باللہ) یہ الفاظ تھے۔ تو واقعہ یہ ہے کہ عربی زبان سے تھوڑا بہت بھی لگاؤ جو رکھتا ہے سننے کے ساتھ ہی سمجھ سکتا ہے کہ زربفت میں یہ ٹاٹ کا پیوند بن جائے گا اور کچھ ان الفاظ کا نہیں بلکہ اور بھی جن جن روایتوں میں ان تفسیری و تشریحی الفاظ کا ذکر کیا گیا ہے بذات خود بتا رہے ہیں کہ قرآنی عبارت کے الفاظ اور ان میں کھلا ہوا فرق ہے مگر اس کے لئے عربی ادب کے ذوق صحیح کی ضرورت ہے۔

۳۔ اسی سلسلہ کی بعض غیر مستند تاریخی روایتوں میں تذکرہ کیا گیا ہے کہ:

اِنَّ ابْنَ مَسْعُوْدٍ کَانَ یُنْکِرُ	حضرت ابن مسعود صحابی سورۂ فاتحہ یعنی الحمد اور معوذتین
کَوْنَ سُوْرَۃِ الْفَاتِحَۃِ	یعنی قل اعوذ برب الناس اور قل اعوذ برب الفلق
وَالْمُعَوِّذَتَیْنِ مِنَ الْقُرْاٰنِ	والی سورتوں کے متعلق کہتے تھے کہ یہ قرآن کے اجزا
(تبیان الجزائری ص۹۶)	نہیں ہیں۔

بالفرض ابن مسعودؓ کی طرف مان لیا جائے کہ یہ انتساب صحیح بھی ہو اور قرآن میں جو تواتر کی قوت پائی جاتی ہے اس کا مقابلہ یہ تاریخی روایت فرض کر لیجئے کہ کر بھی سکتی ہو جب بھی کیا اس کا وہی مطلب ہے جو ظاہر الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ جس کا قرآنی نام السبع المثانی[1] ہے قرآن میں

---

[1] سبع کے معنی سات ہیں اور مثانی ایسی چیز کی تعبیر ہے جو دو دو دفعہ دہرائی جائے چونکہ سورۂ فاتحہ سات آیتوں پر مشتمل ہے اور اس کی خواندگی کا قانونی دستور یعنی نماز میں پڑھنے کا قاعدہ بھی ہے کہ کم از کم دو دفعہ دربار الٰہی میں دہرائی جائے اسی لیے بترا یعنی ایک رکعت کی نماز ممنوع ہے مثانی کہنے کی وجہ یہی ہے۔

اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ہم نے تم کو (اے پیغمبر) سبع مثانی (یعنی سورۂ فاتحہ دی) اور قرآن عظیم دیا۔

جس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ سورۂ فاتحہ کی حقیقت "القرآن العظیم" کے مقابلہ میں جدا رنگ رکھتی ہے جس کی وجہ ظاہر بھی ہے کہ سورۂ فاتحہ کی حیثیت درخواست کی ہے جو خدا کے دربار کی حاضری کے وقت یعنی نماز میں بندے کی طرف سے خدا کی بارگاہ میں پیش ہوتی ہے اور الحمد سے والناس تک اسی کا جواب دیا گیا ہے[1]۔ ابن مسعود نے بھی اگر اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ فرمادیا ہو کہ سورہ فاتحہ "القرآن العظیم" سے الگ حیثیت رکھتی ہے تو اس کا یہ مطلب لینا کیسے صحیح ہوگا کہ سورۂ فاتحہ کے الفاظ کی وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اسی طرح نہیں ہوئی تھی جیسے باقی قرآن کی وحی ہوئی ہے کہ وحی ہونے میں تو دونوں میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ سورۂ فاتحہ اپنی جداگانہ حیثیت جو رکھتی ہے یعنی بندے حق تعالیٰ کے دربار میں جو معروضہ پیش کریں، حق تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے اس معروضہ یا درخواست کی عبارت بھی مرتب کرکے رسول اللہؐ پر وحی فرمادی[2]۔

---

[1] سندی حالت اس روایت کی جو کچھ ہے یہ مسئلہ اور سورۂ فاتحہ و معوذتین جن خصوصی حقائق و معارف پر مشتمل ہیں حضرت الاستاذ گیلانی کی کتاب اور ان کے تفسیری محاضرات میں آپ کو جس کی پوری تفصیل مل سکتی ہے ۱۲۔ [2] دنیا کی دفتری حکومتوں میں بھی بسا اوقات یہی کیا جاتا ہے کہ درخواست کی عبارت حکومت خود بنادیتی ہے اسکو چھاپ کر دفتر میں رکھ دیا جاتا ہے درخواست گزاران مطبوعہ فارم یا تختہ پر دستخط کرکے داخل کر دیا کرتے ہیں۔ ۱۲۔

انہی روایتوں میں ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ معوذتین کے متعلق کہا کرتے تھے کہ:

اِنَّمَا اَمَرَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا ہے
وَسَلَّمَ اَنْ یَّتَعَوَّذَ بِھِمَا	کہ ان دونوں سے تعوذ (پناہ گیری) کا کام لیا جائے

مطلب یہ تھا کہ معوذتین (یعنی قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ) ان دونوں سورتوں کا نزول تعوذ (پناہ گیری) کے لیے ہوا ہے اس لیے قرآن کی دوسری سورتوں کے مقابلہ میں ان کی جداگانہ حیثیت ہے میرے نزدیک تو ان الفاظ سے معوذتین کی اہمیت کو ابن مسعود واضح کرنا چاہتے تھے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ کسی قسم کی مصیبت دنیا میں پیش ہو، ان دونوں سورتوں کے مضامین پر غور کرنے سے تسلی مل جاتی ہے، بہرحال اگر ان روایتوں کے تاریخی ضعف اور اسنادی کمزوریوں سے قطع نظر بھی کر لیا جائے جب بھی ابن مسعودؓ کے اس بیان کا یہ مطلب لینا کہ وہ ان سورتوں کو حق تعالیٰ کے فرمودہ اور نازل کردہ الفاظ نہیں سمجھتے، قطعاً ان پر بہتان ہے اور بدترین قسم کی مغالطہ بازی ہے کیا کسی حیثیت سے بھی کسی کی سمجھ میں یہ بات آسکتی ہے کہ کوئی اور سورہ نہیں بلکہ سورۂ فاتحہ جیسی سورہ جو نماز کی ہر رکعت میں دن کے پانچ وقتوں میں دہرائی جاتی ہے اسی کو سمجھتے تھے کہ قرآن کا جز نہیں ہے کچھ اسی قسم کا مغالطہ حضرت ابی بن کعب صحابی کی طرف اسی روایت کے متعلق ہوا جس میں یہ ہے کہ ان کے قرآنی نسخہ میں وہ دونوں دُعائیں جو قنوت میں عموماً پڑھی جاتی ہیں لکھی ہوئی تھیں اسی بنا پر

یہ غلط فہمی پھیلانے کی بھی بعضوں نے کوشش کی کہ ان دعاؤں کو ابی بن کعب قرآن کے اندر داخل سمجھتے تھے یعنی جیسے دوسری قرآنی سورتیں ہیں اسی طرح دو سورتیں قرآن کی یہ دونوں دعائیں بھی ہیں۔

میں پوچھتا ہوں، آج بھی تو قرآن کے آخر میں مختلف قسم کی دعائیں خصوصاً ختم قرآن کی دُعا، عموماً لکھی ہوئی رہتی ہے کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ دعائیں قرآن میں شریک ہیں۔ اگر روایت صحیح بھی ہو تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ اہمیت کی وجہ سے ابی بن کعب نے اپنے قرآن کے آخر میں ان دونوں مسنونہ دعاؤں کو لکھ لیا ہوگا اور سچ تو یہ ہے کہ روایت ہی بے سروپا ہے میں نے بھی اس کا ذکر صرف تکمیل مضمون کے لئے کر دیا ورنہ یہ روایت تو اس قابل بھی نہیں تھی کہ کسی سنجیدہ علمی مقالہ میں جگہ دی جائے۔

ایک ذیلی بحث اور خاتمہ | مولانا گیلانی نے اپنی کتاب کو جن مباحث پر ختم کیا ہے اسی کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ قرآن تو خیر خدا کی کتاب ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں کی تصنیف کردہ کتابوں مثلاً سعدی کی گلستان ہی کو لیجئے یا اسی جیسی کوئی دوسری کتاب ان کے پڑھنے والوں کو کبھی نہیں دیکھا کہ پڑھنے سے پہلے وہ اس کی ٹوہ میں لگے ہوں کہ مصنف نے کتاب کے کس باب کو پہلے لکھا اور کس کو بعد میں یا ہر باب کی فصلوں کی عبارتوں میں کس عبارت کی یادداشت پہلے جمع ہوئی اور کون بعد میں بلکہ عام قاعدہ یہی ہے کہ مصنف کی طرف سے کتاب پڑھنے والوں کے سامنے جس شکل میں پیش ہوتی ہے اسی آخری شکل کو کتاب کی واقعی شکل قرار دے کر

لوگ پڑھنا پڑھانا شروع کر دیتے ہیں۔

اسی عام دستور کے مطابق ظاہر ہے کہ قرآن کی بھی واقعی شکل اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ جس حال میں پیش کرنے والے نے دنیا کے حوالے قرآن کو کیا بس یہی قرآن کی اصلی شکل ہے، یہی سمجھا بھی گیا، ابتدا سے اس وقت تک اسی شکل میں قرآن نسلاً بعد نسل سے منتقل ہوتا ہوا چلا آرہا ہے لیکن یہ ایک واضح کھلی ہوئی بات ہے لیکن کچھ دن سے یورپ کے مستشرقین نے دنیا کو قرآن کے متعلق ایک خاص مسئلہ کی طرف متوجہ کیا یعنی اس کتاب کی ہر سورۃ کی ہر ہر عبارت کا ہر فقرہ کب نازل ہوا، اس کا پتہ چلانا چاہیے، باور کرایا جاتا ہے کہ قرآن کی صحیح مرتب شکل وہی ہوسکتی ہے جو نزولی ترتیب کی روشنی میں قائم کی جائے۔ مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا تصنیفی کاروبار کرنے والوں کا عام قاعدہ ہے کہ اپنی تصنیف کو آخری شکل میں مرتب کرنے سے پہلے متفرق قسم کی یادداشتوں میں مواد کو نوٹ کرتے رہتے ہیں اور بعد کو ان ہی یادداشتوں کی مدد سے آہستہ آہستہ اپنی کتاب کو مکمل کرتے ہیں بلکہ بسا اوقات یہ بھی کیا جاتا ہے کہ کتاب کے جس حصہ کے متعلقہ مواد کو دیکھتے ہیں کہ فراہم ہو چکا ہے تو پہلے اسی حصہ کو لکھ لیتے ہیں یوں ہی سہولتوں کے لحاظ سے بتدریج یہ کام جب پورا ہو جاتا ہے، تب آخری شکل میں کتاب کو مرتب کر کے دنیا کے سامنے دستور ہے کہ مصنفین اپنی کتاب پیش کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہی آخری شکل اس کتاب کی اصلی اور واقعی شکل قرار

پاتی ہے اور کسی کے دل میں اس کا خطرہ بھی نہیں ہوتا کہ مصنف کو کن کن مراحل سے اپنی تصنیف کے اس جد وجہد میں گزرنا پڑا، اس کا پتہ چلالیے اور اس سلسلہ میں مصنف کے پرانے فائلوں اور ان بستوں کو ٹٹولیے جن میں اس کی یادداشتیں رکھی جاتی تھیں اور کاغذ سیاہی وغیرہ کی کہنگی اور تازگی کو دیکھ دیکھ کر فیصلہ کریئے کہ ان یادداشتوں میں تاریخی طور پر کن کو مقدم اور کن کو موخر قرار دیا جائے یا یہ کہ مصنف نے اپنی کتاب کے کس حصے کو پہلے مکمل کیا اور کس حصہ کی تکمیل بعد کو کی۔ بالفرض "غم نداری بز بخر" کی ان غیر ضروری جھنجھٹوں میں کوئی خواہ مخواہ مبتلا بھی ہو تو ایک قسم کے غیر ضروری خبط کے سوا اسے اور کیا سمجھا جا سکتا ہے تاہم انسانی تصنیفات کے متعلق سراغرسانی کی اس غیر ضروری مہم کا ممکن ہے کچھ فائدہ بھی ہو۔ غریب آدمی زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف حالات سے گزرتا رہتا ہے۔ کبھی انشراح قلب انبساط و نشاط کی حالت میں رہتا ہے کبھی انقباض و کوفت دماغی میں مبتلا ہو جاتا ہے یہ اور اسی قسم کے دوسرے نفسیانی کیفیات کا اثر جیسے زندگی کے تمام شعبوں پر پڑتا ہے۔ انسان کے تصنیفی کاروبار بھی اس سے متاثر ہوں تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے، اور کچھ نہیں تو یہی کیا کم ہے کہ کتاب کے کس حصہ کو نشاط و انبساط کی حالت میں مصنف نے لکھا ہے اور کن حصوں کی تکمیل انقباض و کوفت دماغی کے زمانے میں ہوئی، اس ٹٹول سے اسی کا پتہ چل جائے۔ مگر اللہ میاں کے متعلق تو مزاجی اور دماغی اتار چڑھاؤ کی اس کیفیت کی بھی گنجائش نہیں۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ غیر تو غیر خود مسلمانوں کا ایک طبقہ جو قرآن کو

حدا کی کتاب مانتا ہے ادھر کچھ دنوں سے اس لایعنی، غیر ضروری مشغلے میں یورپ کے مستشرق نما پادریوں کے اغوائی اشاروں سے اُلجھ گیا ہے خود بھی اسی میں الجھا ہوا ہے اور چاہتا ہے کہ جس مسئلہ کا مسلمانوں کے دل پر کسی زمانہ میں کبھی کسی قسم کا کوئی خطرہ بھی نہیں گزرا تھا اسی میں ان کو بھی الجھا دے۔ بڑھتے ہوئے بعض تو یہاں تک پہنچ کر کہنے لگے کہ قرآن کا مطلب ہی مسلمانوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک کہ موجودہ ترتیب کو اُلٹ پلٹ کر نزولی ترتیب پر قرآن کو مرتب کر کے نہ پڑھا جائے۔ بقول مولانا گیلانی پادریوں کی بات تو کچھ سمجھ میں بھی آتی ہے کیونکہ وہ قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی افکار و خیالات کا العیاذ باللہ مجموعہ سمجھتے ہیں اس لیے نزولی ترتیب کے پتہ چلانے کا فائدہ یہ بتاتے ہیں کہ اس ذریعہ سے "ہم ایک زبردست دماغ کی ترقی، ایک پاکیزہ روح کی کمزوری و توانائی اور ایک بڑے انسان کی ناگزیر نیرنگیوں کو دیکھنے لگتے ہیں[1]۔" لیکن خیال تو کیجئے ایک مسلمان بے چارہ جو قرآن کو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا نہیں بلکہ خالق کائنات کی براہِ راست کتاب یقین کرتا ہے کیا اس نزولی ترتیب کی جستجو کی تلاش میں پاپڑ بیلنے کے بعد اللہ میاں کی پاکیزہ روح کی "کمزوریوں اور ناگزیر نیرنگیوں" کا تماشا دیکھنا چاہتا ہے؟ یا نزولی ترتیب کی جستجو کی دعوت دینے والے کیا اپنے پیدا کرنے والے مالک کی ان ہی مذبوحی حرکات کا تماشا خود

---

[1] لین پول خطبات و احادیث رسول ص ۱۰

بھی اور مسلمانوں کو بھی دکھانا چاہتے ہیں؟

میں نے جیسا کہ عرض کیا، انسانی تصنیفوں کے متعلق بھی جب اس قسم کی کرپزگیوں کا مالیخولیا دماغوں میں پیدا نہیں ہوتا تو العیاذ باللہ حق سبحانہٗ تعالیٰ کی کتاب کے متعلق اس سوال کے اٹھانے کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں؟ اور کوئی چاہے بھی تو میں نہیں سمجھتا کہ انسانی تصانیف کے متعلق بھی ان باتوں کا پتہ چلانا آسان ہے مصنف کو اپنی اس کتاب کی ترتیب کے سلسلہ میں کن مرحلوں سے گزرنا پڑا، یادداشتوں میں کون سی یادداشت پہلے نوٹ ہوئی اور کونسی بعد میں یا کتاب کا کونسا حصہ پہلے مکمل ہوا، اور کون سا بعد میں قرآن کے ساتھ مسلمانوں کی غیر معمولی دلچسپیوں سے جہاں بہت سی عجیب و غریب چیزیں قرآن کے متعلق پیدا ہو گئی ہیں، مثلاً اس کتاب کے ایک ایک حرف اور حروف کے اعراب یعنی زیر و زبر، پیش، سب ہی کو تو ایک کام سمجھ کر گن لیا گیا ہے اور جو کچھ اس سلسلے میں تیرہ سو برسوں کی طویل مدت میں مسلمان کرتے چلے آئے ہیں ایک مستقل کتاب کا وہ مضمون ہے۔ غیر معمولی دلچسپیوں کے اسی ذیل میں تمام کتابوں کے مقابلہ میں صرف قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جس کے کُل تو نہیں لیکن معقول اور معتد بہ حصے کے متعلق مسلمانوں میں ایسی روایتیں پائی جاتی ہیں جن سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ اس کتاب کی کون سورۃ کس مقام میں اُتری یعنی مکہ میں یا مدینہ میں، اسی طرح انہی روایتوں میں اس کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ فلاں آیت یا آیتوں کا

مجموعہ فلاں مشہور واقعہ کے وقت اترا شانِ نزول کی اصطلاح ان ہی معلومات کے متعلق مسلمانوں میں مروج ہے۔

بہرحال اتنی بات درست ہے کہ ان روایتوں کی مدد سے سورتوں کی کافی تعداد کے متعلق اس کا پتہ چلا لیا گیا ہے کہ وہ مکہ میں اُتری تھیں یا مدینہ میں اور تھوڑی بہت آیتوں کے متعلق بھی کوئی چاہے تو اس قسم کی معلومات فراہم کرسکتا ہے لیکن ان ساری معلومات کے بعد بھی مسلمانوں نے نہیں بلکہ یورپ کے ان ہی پادریوں نے جو آج کل استشراق کی نقاب چہروں پر ڈال کر یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ بجائے دینی اور مذہبی عصبیت کے ان کے کاروبار کا تعلق صرف علمی تحقیقات سے ہے ان ہی مستشرقین کا یہی طبقہ دو ڈھائی سو سال کی کدوکاوش کے بعد اس نتیجہ تک پہنچا ہے کہ :

"صحیح ترتیب نزول کا معلوم کرنا ناممکن ہے۔" (نولڈیکی)

ہرش فیلڈ جو اسی فیلڈ کا مشہور سپاہی ہے اس بے چارے کو بھی اسی اعتراف پر مجبور ہونا پڑا کہ :

"میں پہلے ہی سے اس کا اقرار کیوں نہ کرلوں کہ اس سلسلہ میں (نزولی ترتیب کی جاسوسی میں) قابلِ اعتماد نتائج حاصل کرنے کی بہت ہی کم امید ہے۔"

(یہ فقرے پروفیسر اجمل کی کتاب سے لیے گئے ہیں جو اسی مسئلہ پر انہوں نے لکھی ہے)

اور یہ حال تو اس وقت ہے جب قرآن کی موجودہ متواتر قطعی مسلمہ

ترتیب میں ترمیم کی اجازت ان روایتوں کی بنیاد پر دیدی جائے جو شانِ نزول کے سلسلہ میں ہماری کتابوں کے اندر پائی جاتی ہیں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ روایات کا جو ذخیرہ ہمارے یہاں پایا جاتا ہے اس ذخیرے میں سب سے زیادہ کمزور اور حد سے زیادہ ضعف ان روایتوں کی خصوصیت ہے جن کا تعلق قرآن کی تفسیر وغیرہ سے ہے' امام احمد بن حنبلؒ کا تو اس سلسلہ میں یہ مشہور قول ہے کہ ثلاثۃ لیس لھا اصل التفسیر والملاحم والمغازی[1] یعنی روایات کا جو ذخیرہ حدیث کی کتابوں میں پایا جاتا ہے اس میں ایسی روایتیں جن کا تعلق تفسیر یا ملاحم (آئندہ پیش آنے والی جنگوں کی پیش گوئیاں یا مغازی (عہدِ نبوت کی جنگی مہموں کے قصے) امام احمد فرماتے تھے کہ ان تینوں قسم کی روایتوں کی کوئی صحیح بنیاد نہیں ہے سیوطی نے اس قول پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سب کو بے اصل قرار دینا تو مشکل ہے لیکن اسی کے ساتھ اس کا اعتراف خود سیوطی نے بھی کیا ہے کہ قابلِ اعتماد روایتیں تفسیر کے سلسلہ میں قلیل جداً اور یہ فی غایۃ القلۃ[2]

محدثین کا اس پر اتفاق ہے، تواتر و توارث کے نیرِ تاباں کی روشنی میں مذہبًا نہ سہی عقلاً ہی سہی میں پوچھتا ہوں کہ جگنو کے دُم کی روشنی سے کیا مغلوب ہو سکتی ہے جن چیزوں کو آفتاب کی روشنی میں ہم دیکھ رہے ہیں اور جو معلومات اس روشنی میں حاصل ہوئی ہیں، کیا ان معلومات میں ترمیم کی جسارت ان چیزوں کی مدد سے کوئی کر سکتا ہے جن پر گھپ اندھیری

---

[1] اتقان جلد ۲ صفحہ ۵۳۸ [2] اتقان ج ۲ صفحہ ۵۲۹

رات میں جگنوؤں کی دُم کی روشنی میں اتفاقاً کسی کی نظر پڑ گئی یقین کیجئے کہ قرآن کی موجودہ مرتب شکل کے متعلق ہمارے علم کی عقلی کیفیت، نزولی روایات کے مقابلہ میں یہی بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہے[۱]

نزولی ترتیب کا ایک تاریخی لطیفہ

اسی نزولی ترتیب کے متعلق ایک دل چسپ لطیفہ وہ بھی ہے جسے منسوب کرنیوالوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب کرکے کچھ اس طرح اسے مشہور کر دیا ہے کہ عوام میں گویا یہ مان لیا گیا ہے کہ

[۱] نزولی روایات کی حیثیت اور سنداً ان کا دوسری اسلامی روایات کے مقابلہ میں کیا درجہ ہے ایک مستقل مضمون ہے۔ سب سے پہلا مسئلہ اس سلسلہ کا یہ ہے کہ کسی آیت یا آیتوں کے کسی مجموعہ کے متعلق صحابی یا تابعی جب یہ کہتے ہیں کہ فلاں معاملہ میں نازل ہوئی یعنی نزل فی کذا کہتے ہیں تو اس کا واقعی مطلب کیا ہوتا ہے شیخ الاسلام ابن تیمیہ علامہ زرکشی صاحب "البرہان" حضرت شاہ ولی صاحب اور دوسرے اکابر ائمہ اسلام نے تصریح کی ہے کہ جس معاملہ میں یا جس واقعہ پر قرآن کی وہ آیت صادق آتی ہے تو اس کے متعلق تعبیر کا یہ ایک طریقہ تھا یعنی یہ آیت فلاں چیز پر صادق آتی ہے اسی مفہوم کو نزل فی کذا کے الفاظ سے لوگ ادا کرتے تھے۔

قیامت تک پیش آنے والے واقعات پر قرآنی آیتیں عموماً صادق آتی ہیں اس لیے ہم ہر زمانہ میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ آیت فلاں معاملہ یا واقعہ یا مسئلہ کے متعلق نازل ہوئی لیکن اس کا یہ مطلب کہ واقعتہً اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی صحیح نہ ہوگا دیکھو اتقان (نوع ۹) شاہ ولی اللہ نے الفوز الکبیر میں بھی یہی لکھا ہے۔ ابن تیمیہ اور زرکشی کے اقوال اتقان میں ہیں، علاوہ اس کے کون نہیں جانتا کہ نزولی روایتوں سے

(باقی صفحہ ۹۴ پر)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے نزولی ترتیب پر قرآن کو مرتب کر کے ایک
نسخہ واقعہ میں تیار کیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس نزولی ترتیب کا مطلب اگر صرف یہی ہے
کہ جلد بندی میں سورتوں کی یعنی ان قرآنی رسالوں کی جو ترتیب اس وقت
پائی جاتی ہے یعنی پہلے سورۂ فاتحہ پھر البقرہ پھر آل عمران آخر الناس تک
حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نسخہ میں سورتوں کی ترتیب یہ نہ تھی تو میں یہ
عرض کر چکا ہوں کہ اس میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کسی ایک مصنف
کی چند کتابوں مثلاً سعدی کی گلستاں و بوستاں کی جلد بندی میں

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) بخاری و مسلم بلکہ صحاح ستہ کی اکثر کتابیں خالی ہیں، دوسرے بلکہ
زیادہ تر تیسرے درجہ کی کتابوں میں یہ روایتیں ملتی ہیں اور اس پر بھی حال ان روایتوں
کا یہ ہے کہ ایک ایک آیت کے متعلق شان نزول کی روایتوں میں متعدد واقعے بیان
کیے گئے ہیں ان روایتوں کی کیا حالت ہے ان کا سرسری اندازہ اسی سے ہو سکتا
ہے کہ اور تو اور یہ مسئلہ کہ سب سے پہلی نازل ہونے والی آیت تک کے متعلق ایک سے
زائد روایتیں پائی جاتی ہیں عام طور پر اقراء کے متعلق مشہور ہے لیکن نزولی روایات
کے ذخیرہ میں دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ بعض لوگ سورۂ فاتحہ کو بعض لوگ سورۂ الفلق کو
سب سے پہلی نازل ہونے والی سورۃ قرار دیتے ہیں اسی طرح کہاں نازل ہوئی؟ اس سوال
کے جواب میں آپ کو سورۂ فاتحہ تک کے متعلق معلوم ہوگا کہ بجائے مکہ کے کہتے ہیں مدینہ میں
نازل ہوئی اور یہ تو عام بات ہے کہ ایک ہی آیت کے متعلق پانچ پانچ چھ چھ شان نزول تک
مروی ہے۔ ابن قیم نے محدثین کے اس طرز عمل پر کہ ان ہی نزولی روایتوں کی وجہ سے کہہ دیتے ہیں
کہ فلاں آیت پانچ دفعہ مثلاً نازل ہوئی سخت تنقید کی ہے۔ ۱۲۔ (مناظر احسن گیلانی)

ہیں آپ خواہ بوستاں کو پہلے رکھوائیے یا گلستاں کو ان دونوں کتابوں کے مضامین پر کوئی اثر اس کا نہیں پڑتا اور ابھی آپ کو معلوم ہوگا کہ بعض دوسرے صحابہ کے قرآنی نسخوں کے متعلق کتابوں میں لکھا ہے کہ ان میں بھی سورتوں کی ترتیب وہ نہ تھی جو اس وقت پائی جاتی ہے۔

لیکن اس نزولی ترتیب کا مطلب اگر یہ ہے کہ ہر ہر سورہ میں آیتوں کے اندر جو ترتیب اس وقت پائی جاتی ہے، حضرت علی والے مرتبہ نسخے میں بجائے اس ترتیب کے کوئی اور ترتیب آیتوں میں دی گئی تھی تو اس کا مطلب اور نتیجہ کیا ہو سکتا ہے؟ اس کی دلچسپ داستان تو ابھی آپ کو معلوم ہو گی لیکن چونکہ حضرت علی کی طرف اس روایت کو منسوب کرکے مختلف قسم کی غلطیاں پھیلانے والے پھیلا رہے ہیں اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود اس روایت کی جو واقعی حیثیت اور کیفیت ہے پہلے اس سے مسلمانوں کو مطلع کر دیا جائے۔

بقول مولانا گیلانی واقعہ صرف یہ ہے کہ روایات اور حدیثوں کی موجودہ عام کتابوں مثلاً بخاری و مسلم اور ان کے سوا صحاح کی جو دوسری کتابیں ہیں ان میں سے کسی کتاب میں یہ روایت نہیں پائی جاتی۔ حدیث کی ان کتابوں میں ہی نہیں بلکہ جن کتابوں کو حدیث کی کتابیں کہتے ہیں خواہ سنداً ان کا مقام کتنا ہی گرا ہوا ہو ان میں بھی یہ روایت نہیں ملتی چند معروف کتابیں جن کا ذکر سیوطی نے اتقان میں کیا ہے ان کے سوا سند کے ساتھ صرف ابن سعد کی کتاب طبقات میں اس وقت تک مجھے

یہ روایت ملی ہے۔ کنز العمال میں بھی اس روایت کو نقل کر کے صرف ابن سعد ہی کا حوالہ دیا ہے جس میں یہی سمجھ میں آتا ہے کہ صاحب کنز العمال بلکہ جلال الدین سیوطی نے رطب و یابس روایتوں کی محیط (النسائیکلوپیڈیا) جب تیار کرنی چاہی تو ان دونوں بزرگوں کو بھی غالباً ابن سعد کے طبقات کے سوا کسی ایسی کتاب میں یہ اثر نہیں ملا جسے وہ لایق ذکر خیال کرتے بہر حال ابن سعد نے جن الفاظ میں اس روایت کو درج کیا ہے ان کو پڑھ لیجئے جو یہ ہیں:

عن محمد قال نُبِّئتُ ان علیا ابطاء عن بیعة ابی بکر فلقیه ابوبکر فقال اکرهت امارتی فقال لا و لکنی الیت بیمین ان لا ارتدی بردائی الا الی الصلوٰة حتی اجمع القرآن۔	محمد (بن سیرین) سے یہ روایت ہے، وہ کہتے تھے مجھے یہ اطلاع دی گئی ہے کہ حضرت علیؓ کی طرف سے جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت میں کچھ تاخیر ہوئی تب حضرت ابو بکرؓ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملے اور پوچھا کہ میری امارت (یعنی خلافت) کو تم نے ناپسند کیا۔ اس پر حضرت علی نے فرمایا کہ نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ میں نے یہ قسم کھائی تھی کہ نماز کے سوا اپنی چادر (جسے اوڑھ کر باہر نکلتے تھے اسے) نہ اوڑھوں گا جب تک کہ قرآن کو جمع نہ کر لوں۔

اصل روایت تو اسی پر ختم ہوتی ہے، آگے محمد یعنی ابن سیرین نے آخر میں اتنا اضافہ اور کیا کہ،

فزعموا انہ کتبہ علی تنزیلہ   لوگ خیال کرتے ہیں کہ حضرت علی نے

(ابن سعد ج ۲ ص ۱۰۱ مطبوعہ یورپ)   تنزیل پر اس قرآن کو لکھا تھا۔

بس یہ سارا فتنہ قرآن کی نزولی ترتیب کا ابن سیرین کے ان ہی الفاظ کتبہ علی تنزیلہ کو بنیاد بنا کر اٹھایا گیا۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ بعض روایتوں میں اپنے خود تراشیدہ مطالب بھر کر ان سے لوگوں نے ناجائز نفع اٹھایا ہے ان میں ایک روایت یہ بھی ہے، علامہ شہاب محمود آلوسی نے اپنی تفسیر روح المعانی کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اسی روایت کو چنگاری بنا کر فتنے کی آگ جن لوگوں نے پھیلائی ان میں سب سے زیادہ نمایاں شخصیت ابوحیان توحیدی کی ہے (دیکھئے مقدمہ روح المعانی ص ۹ ج ۱) یہ ابوحیان توحیدی کون تھا اور زندگی بھر کیا کرتا رہا اس کا قصہ تاریخوں میں پڑھیے[1]

---

[1] ابوحیان توحیدی کے کچھ حالات لسان المیزان میں حافظ ابن حجر نے بھی بیان کیے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہ چوتھی صدی کا آدمی ہے، اس عہد کے دو مشہور وزیر صاحب بن عباد اور ابن عمید کے درباریوں میں تھا علم کو دنیا طلبی کا ذریعہ ان ہی وزرا کے دربار میں گھس کر بنانا چاہا جیسا کہ اسی کا بیان ہے اس مقصد میں کامیابی اس کو نہ ہوئی تو بقول اکبر مرحوم ؎ ہوگیا فیل امتحانوں میں ؛ اب ارادہ ہے بدمعاشی کا۔ ابوحیان بھی فتنہ انگیزی کے منحوس مشغلہ میں مصروف ہوگیا۔ آدمی قابل تھا اور فلاسفہ کا ادیب اور ادیبوں کا فلسفی تھا۔ مقامات حریری کے سروجی کا پارٹ ادا کیا کرتا تھا اسی لیے بعض لوگوں نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ وہ صوفیوں کا شیخ، فلاسفہ کا ادیب

بہرحال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سورتوں کی ترتیب کا ذکر اگر اس روایت

اور ادیبوں کا فلسفی تھا یعنی فلسفہ والوں کے سامنے ادیب بنتا تھا اور ادیبوں کے سامنے فلسفی اور جیسے ابن راوندی کرایہ پر مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی طرف سے کتابیں لکھا کرتا تھا، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہی پیشہ تنگ آکر اس فیلسوف الادباء اور ادیب الفلاسفہ نے اختیار کر لیا تھا۔ جعلی کتابوں کے بنانے میں کمال تھا، لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر کے نام سے ایک طویل خط اس نے تصنیف کیا اور ظاہر یہ کیا کہ حضرت علی نے ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے جب انکار کیا تو دونوں ابوبکر و عمر نے مل کر یہ خط حضرت علی کو لکھا تھا، اس خط میں کہیں تو خوشامد کی باتیں تھیں اور کہیں دھمکیاں حضرت علی کو دی گئی تھیں الغرض اس جعلی خط کو لکھ کر مسلمانوں میں اس نے پھیلا دیا جب فتنہ زیادہ بڑھا تو بعض لوگوں نے اس سے دریافت کیا، ایک دن راز کھول دیا کہ شیعوں کے خلاف خود ہی میں نے یہ جعلی خط بنایا ہے، حالانکہ شیعوں سے زیادہ اس میں سنیوں کے خلاف مواد تھا، ایسی باتیں ابوبکر و عمر کی طرف منسوب کی گئی تھیں جو کسی معمولی مسلمان کی طرف بھی کاربرآری کے سلسلہ میں منسوب نہیں ہو سکتیں۔ اس سلسلہ میں ان حضرت کے اور کارنامے بھی ہیں، اسی بنا پر علماء حق نے اس کے متعلق اس فیصلہ کا اپنی کتابوں میں اعلان کیا کہ یہ بڑا جھوٹا مفتری دین نے مفلس، علانیہ بیہودہ بکواس کرنیوالا اور جن باتوں سے دینی نظام پر زد پڑتی ہو ان کے پھیلانے میں کمال رکھتا تھا، حافظ ابن حجر نے ابن مالی کی کتاب "الفریدہ" سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں،

ابن جوزی نے بھی لکھا ہے کہ "ابوحیان زندیق تھا، اس کی انہی حبارتوں کی وجہ سے مہلبی وزیر نے اس کو جلا وطن بھی کر دیا تھا۔ اصلی نام علی بن محمد تھا، لکھا ہے کہ جب مرنے لگا تو اس کے شاگرد جو بستر علالت کے ارد گرد جمع تھے اور اس کی زندگی کی خصوصیتوں سے واقف تھے،

(باقی صفحہ ۹۹ پر)

میں ہے اور روایت کے جو الفاظ ہیں ان میں یقیناً اس کی بھی گنجائش ہے تو اس وقت تو خیر کوئی بات ہی نہیں ہے اب بھی مسلمان بچوں کے پڑھانے کے لیے "عم" کے پارے کی سورتوں کی ترتیب بدل دیتے ہیں یعنی پہلے والناس پھر الفلق اور آخر میں سورہ عم یتساءلون ان پاروں میں چھاپی جاتی ہے۔ چونکہ ہر سورۃ اپنی مستقل حیثیت رکھتی ہے اس لیے ترتیب کی اس تبدیلی کا کوئی اثر معانی و مطالب پر نہیں پڑتا، اور مقصد اگر سورتوں کی آیتوں کی اُلٹ پھیر کا ہے، غالباً فتنہ پردازوں کی بُری نیت ہی ہے بھی، ورنہ سورتوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ) گھبرا کر بے چاروں نے اللہ اللہ کی تلقین شروع کی، اور توبہ و استغفار کے لیے اس کو ہدایت کرنے لگے۔ کہتے ہیں کہ ابوحیان نے آنکھیں کھولیں، اور سر اٹھا کر بولا کہ کیا میں کسی فوجی سپاہی یا پولیس کے پاس جا رہا ہوں، پھر کہا۔ "رب غفور" کے دربار میں حاضر ہو رہا ہوں۔ اسی آخری فقرے پر دم نکل گیا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوا، دراصل اس کے مزاج میں شوخی اور گستاخی تھی۔ ادب سے محروم تھا۔ صاحب بن عباد اور ابن العمید کے دربار میں جب توقعات رکھتا تھا تو لوگوں نے بیان کیا ہے کہ ان کی تعریف میں مبالغہ کرتے ہوئے یہ تک اس نے لکھ مارا کہ یہ دونوں اگر نبوت کا دعویٰ کر بیٹھیں تو ان پر بھی وحی نازل ہونے لگے اور شریعت نئی ہو جائے مسلمانوں کے دینی اختلافات کا خاتمہ ہو جائے۔ متعدد جعلی حدیثوں کے مشہور کرنے میں اس نے خاصی شہرت حاصل کی جن میں حضرت علی والی یہ روایت بھی ہے۔ یعنی قرآن کی نزولی ترتیب کی وجہ سے بیعت سے رُکے رہے۔ (دیکھو لسان المیزان صفحہ ۳۷۲) (مناظر احسن گیلانی)

کی نزولی ترتیب کے مسئلہ کو اتنی اہمیت کیوں دیتے تو قطع نظر اس سے کہ بجائے سورتوں کے یہ دعویٰ جو کیا جاتا ہے کہ مراد آیتوں کی ترتیب ہے اس دعوے کا ثبوت دعویٰ کرنے والوں کے ذمہ ہے اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس دعوے کے ثبوت کے لیے وہ کوئی قرینہ پیش نہیں کر سکتے مگر بہر حال مان لیا جائے کہ ان الفاظ کا وہی مطلب ہے جو خواہ مخواہ بلا وجہ زبردستی ان الفاظ سے نکالنا چاہتے ہیں تو اب آیئے اور دیکھیے کہ سنداً اس روایت کا کیا حال ہے آپ دیکھ رہے ہیں کہ محمد یعنی ابن سیرین روایت کی ابتدا کرتے ہوئے "نبئت" لفظ بولتے ہیں، یعنی کہتے ہیں کہ مجھے اطلاع دی گئی لیکن کس نے اطلاع دی اس اطلاع دینے والے کا نام نہیں بتاتے، لیجیے راوی مجہول ہو گیا، اور ایسی روایت جس کے راوی کا حال تو حال نام تک معلوم نہ ہو، خود سوچیے کہ اس کی قیمت کیا باقی رہی، یہ حال تو اصل روایت کا ہے، پھر روایت کو ختم کر کے مزید اضافہ آخر میں ابن سیرین نے اپنی طرف سے جو کیا ہے اور اسی اضافہ میں ترتیب کی تبدیلی کا ذکر ہے۔ اس اضافہ کو بھی "زعموا" کے لفظ سے ادا کرتے ہیں جس کا عام ترجمہ اردو میں یہ کیا جا سکتا ہے یعنی "خیال کرتے ہیں" پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ خیال کرنے والے کون لوگ ہیں؟ ابن سیرین یہ بھی نہیں بتاتے، جس سے پتہ چل سکتا تھا کہ وہ کس قسم کے لوگ تھے نیز "زعموا" کا لفظ عربی زبان کے لفظ "زعم" سے بنا ہے "زعم" کا یہ لفظ بجائے خود اپنے اندر حد سے زیادہ کمزوری کو چھپائے ہوئے ہے۔ بعض بزرگوں کے متعلق لکھا ہے کہ اپنے لڑکوں سے انہوں نے کہا تھا کہ "زعموا" کا لفظ مجھے بخش دو، یعنی کبھی استعمال نہ کرنا، حدیثوں

میں بھی آیا ہے کہ جھوٹ کو چلتا کرنے کے لئے "زعموا" کا لفظ بہت اچھی سواری کا کام دیتا ہے جیسے اس زمانے کی اخبار نویسی میں "سمجھا جاتا ہے"۔ "قیاس کیا جاتا ہے"۔ "معتبر حلقوں سے یہ بات پھیلی ہے" یہ یا اسی قسم کے فقرے دراصل جھوٹ کو آگے بڑھانے کی عصری سواریاں ہیں۔ حافظ ابن حجر نے انقطاع کا نقص بتاتے ہوئے اس روایت کو سنداً مسترد کر دیا ہے (دیکھو اتقان ج ۱ ص ۸۲) اور خواہ مخواہ مان بھی لیا جائے کہ روایت کلیتہً بے اصل نہیں ہے جب بھی عرض کر چکا ہوں کہ "نزولی ترتیب" ایسی تعبیر ہے جس میں سورتوں اور آیتوں دونوں کی ترتیب کا احتمال ہے لیکن مدعائے مدعیوں کا جب ہی ثابت ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ذریعہ سے یہ ثابت کریں کہ سورتوں کی ترتیب نہیں بلکہ ہر سورۃ کی آیتوں کی موجودہ ترتیب کی جگہ نزولی ترتیب حضرت والا نے دی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس احتمال کے معین کرنے کی قطعاً کوئی صورت نہیں ہے علاوہ اس کے علماء نے لکھا ہے کہ بعض روایتوں سے جو معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ ومنسوخ آیتوں کو ایک ہی جگہ مرتب کر کے حضرت علی نے ایک کتاب لکھی تھی اور اسی کی طرف یہ اشارہ ہے تو بقول آلوسی پھر یہ قرآن کا نسخہ ہی کب باقی رہا یہ تو "ناسخ منسوخ" کی دوسری کتابوں کی طرح ایک کتاب ہو گئی اور بیسیوں احتمالات ہیں کہنا یہی ہے کہ لے دے کے اسی ایک ٹوٹی پھوٹی شکستہ و برشتہ روایت کو بنیاد بنا کر یقین کی اس قوت کو مضمحل کرنے کی کوشش کرنا جو قرآن کی موجودہ متواتر و متوارث ترتیب کے متعلق انسانی فطرت رکھتی ہے بجز

مغالطہ بازی کے اور کیا ہے۔[لہ]

نزولی ترتیب پر قرآن کو مرتب کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا

ماسوا اس کے سب سے زیادہ دلچسپ مسئلہ بقول مولانا گیلانی یہ ہے کہ نزولی ترتیب کے ڈھنڈورا پیٹنے والوں نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ خدانخواستہ اسی ترتیب پر ہر ہر سورۃ کی آیتوں کو مرتب کرنے کی کوشش میں اگر کوئی کامیاب ہو بھی

لہ اتقان میں سیوطی نے جیسا کہ میں نے عرض کیا بعض غیر مشہور کتابوں کا حوالہ دے کر بھی اس روایت کا ذکر کیا ہے مثلاً ابن الفریس کی کتاب الفضائل کی طرف منسوب کرکے ابن سیرین ہی کی اس روایت کو درج کرتے ہوئے نئی بات کا اضافہ یہ کیا ہے کہ ابن سیرین سے عکرمہ (مولی ابن عباس) نے اس قصہ کا ذکر کیا تھا اس پر ابن سیرین نے عکرمہ سے دریافت کیا کہ حضرت علی کے قرآن جمع کرنے کا مطلب کیا تھا کہ "کما انزل الاول فالاول یعنی جو پہلے نازل ہوئی اس کو پہلے پھر اس کے بعد جو نازل ہوئی اس کو بعد بالفاظ دیگر ابن سیرین نے یہ سوال کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیا نزولی ترتیب پر جمع کیا تھا؟ اس روایت میں ہے کہ جواب میں عکرمہ نے کہا کہ "جن وانس بھی اکٹھے ہو کر چاہیں کہ قرآن کو اس ترتیب پر مرتب کریں تو یہ ان کے بس کی بات نہیں ہے۔" عکرمہ کے عربی الفاظ یہ ہیں لَوِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اَنْ یُّؤَلِّفُوْہُ ذٰلِکَ التَّاْلِیْفَ مَا اسْتَطَاعُوْا۔ اسی طرح ابن اشتہ کی کتاب المصاحف سے سیوطی نے نقل کیا ہے کہ ابن سیرین کہا کرتے تھے کہ حضرت علی والے مرتبہ قرآن کے متعلق مدینہ کے لوگوں کو لکھا اور بہت تلاش کیا لیکن مجھے نہ مل سکا۔ خود یہ خبر بھی اس روایت کے جعلی ہونے کی دلیل ہے۔ آخر حضرت علی کرم اللہ وجہہ

(باقی صفحہ ۱۰۳ پر)

جائے۔ جس طرح وہ نازل ہوتی رہی ہیں تو آیتوں میں اس تاریخی ترتیب کے پیدا کرنے کی سعی لاحاصل کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس کو سوچنے کے لیے میں آپ کی توجہ پھر ادھر منعطف کرانا چاہتا ہوں جس کا ذکر شروع مضمون میں بھی اجمالاً آچکا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنی سورتوں کی حیثیت کسی واحد بسیط کتاب کی نہیں ہے بلکہ ہر ہر سورہ کا موضوع اور اس کی غرض و غایت دوسری سورہ کے مقابلے میں مستقل حیثیت رکھتی ہے علاوہ اس کے کہ تجربہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ سورتوں کے مضامین کی اسی استقلالی حیثیت کے احساس ہی کا نتیجہ عہدِ صحابہ میں یہ تھا کہ صرف دو صورتیں یعنی سورۂ انفال اور سورۂ برأت کے مضامین میں تھوڑا بہت وحدت کا رنگ جو پایا جاتا تھا لیکن پھر بھی دونوں کی حیثیت چونکہ بالکلیہ ایک نہ تھی آپ جانتے ہیں کہ امتیاز کے اسی رنگ کو باقی رکھنے کے لیے کیا کیا گیا؟ یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ ہر سورہ دوسری سورہ سے "بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ" کے فقرہ سے جدا کی گئی ہے، لیکن ان دونوں سورتوں کے بیچ میں "بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ" نہیں ہے۔ حضرت عثمانؓ سے جب پوچھا گیا کہ ایسا کیوں کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ: كَانَتۡ قِصَّتُهَا شَبِيهَةً بِقِصَّتِهَا یعنی دونوں سورتوں کے مضامین ملتے جلتے تھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۲) کا یہ مرتبہ نسخہ اور کسی کے پاس نہ سہی خاندان اہلبیت میں اس کے نہ ملنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے بلکہ بقول ابن حزم حضرت علیؓ کو اپنی خلافت کے زمانہ میں پانچ سال نو مہینہ کی مدت ملی جاتے تو اپنی حکومت کے ان دنوں میں اپنے مرتبہ نسخوں کو مسلمانوں میں پھیلا دیتے۔ ۱۲

فظننت انها منها فقبض رسول الله صلى الله عليه وسلم ولم يبين لنا انها منها فمن اجل ذالك قرنت بينهما ولم اكتب بينهما بسم الله الرحمن الرحيم

(ابوداؤد و ترمذی از جمع الفوائد)

اس لیے ہم نے خیال کیا کہ یہ (برأت) بھی اسی میں سے ہے (یعنی انفال ہی میں داخل ہے) اتنے میں رسول اللہ کی وفات ہو گئی مگر آپ سے یہ بات معلوم نہ ہو سکی کہ واقعی برأت انفال میں سے ہے اس لیے دونوں کو ہم نے جوڑ تو دیا لیکن بسم اللہ الرحمن الرحیم ان دونوں کے بیچ میں نہ لکھا۔

آپ دیکھ رہے ہیں سورتوں کے مضامین کے مسئلہ میں صحابہ کے احساس کی اس غیر معمولی نزاکت کو؟ سورتوں کی وحدت اور تعدد کا مدار مضامین کی وحدت و تعدد پر ہے۔ صحابہ کا جو نقطۂ نظر اس باب میں تھا کیا اس کے لیے اس سے زیادہ واضح شہادت کی ضرورت ہے، بہر حال یہ ایک واقعہ ہے کہ دیکھنے میں قرآن کی سورہ کتنی بھی چھوٹی نظر آتی ہو جیسے ہاتھی کے مقابلہ میں چیونٹی، لیکن ایک مستقل جسمانی نظام کی بہر حال چیونٹی بھی مالک ہے یہی حال ہر سورہ کا ہے[1]۔ اور کہا جا سکتا ہے، جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ موضوع اور غرض و غایت کے لحاظ سے جیسے جغرافیہ کا

---

[1] مثلاً سورہ قل ہو اللہ احد یا الکوثر یا العصر ہی کو لیجئے تین چار آیتوں سے زیادہ ان میں کوئی سورہ نہیں ہے لیکن جن حقائق اور معانی سے ان میں کی ہر ایک لبریز ہے اور انسانی زندگی کے جن خاص شعبوں کے متعلق حیرت انگیز انکشافات ان سے ہوتے ہیں کسی جاننے والے سے پوچھیے کچھ نہیں تو علامہ فراہی کی تفسیر کا اردو میں ترجمہ ہو گیا ہے اسی کا مطالعہ کیا جائے۔ ۱۲

علم طب سے اور طب کا تاریخ سے، تاریخ کا علم کیمسٹری سے اپنی الگ مستقل حیثیت رکھتا ہے، یہی اور بجنسہٖ یہی حال قرآن کی ہر سورہ کا دوسری سورہ کے مقابلہ میں ہے۔

اب ذرا خیال کیجئے کہ نزولی ترتیب پر ہر ہر سورہ کی آیتوں کو مرتب کرنے کے معنی کیا ہوں گے۔ مذکورہ بالا مختلف علوم و فنون مثلاً طب، جغرافیہ اکانومی کیمسٹری اکانومی وغیرہ کی کتابیں جن کا مصنف فرض کیجئے ایک ہی شخص ہو، اور ان ساری کتابوں کو آگے پیچھے شروع کرکے اس نے خاص مدت میں ختم کی ہوں اب اگر اسی مصنف کی ان تمام قدیم یادداشتوں کے تلاش کرنے میں کوئی کامیاب بھی ہو جائے جنہیں مختلف علوم و فنون کی ان کتابوں کی تالیف و تصنیف کے سلسلہ میں وقتاً فوقتاً مصنف جمع کرتا رہا اور ان ہی کی مدد سے ہر کتاب کو اس نے مکمل کیا تھا۔ پھر ان تمام یادداشتوں میں تاریخی ترتیب پیدا کرکے سب کو مرتب کرکے کسی کتاب کی شکل میں کوئی اگر پیش کرے تو صورت اس کتاب کی کیا ہو جائے گی؟ اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے اگر آپ کو اس کتاب کی ابتدائی چند سطروں میں تو طب کے کچھ نسخے اور مسائل ملیں اور ان ہی کے بعد خفرد ں میں جغرافیہ کی معلومات ان کے بعد کیمسٹری کے نظریات علیٰ ہذا القیاس چوں چوں کا مربہ کوئی واقعہ ہو یا نہ ہو لیکن یہ کتاب تو یقیناً چوں چوں کا مربہ ادیوانی ہنڈیا بن کر رہ جائے گی۔

بہرحال قرآن کی موجودہ ترتیبی شکل تواتر اور توارث کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے ایک ایسی قطعی حقیقت کے متعلق نزولی ترتیب والی ایسی روایتوں

کی مدد سے ترمیم پر آمادہ ہو جانا جن کی سند کو حدیثوں کی صحت کے مقررہ معیار پر پورا اُترنا آسان نہیں ہے، جنون نہیں تو اور کیا ہے۔ اتقان میں سیوطی نے طبرانی کے حوالہ سے ایک روایت نقل کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس کی سند جید ہے، حاصل اس کا یہ ہے، کسی نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ صحابی سے پوچھا کہ ایسے آدمی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے کہ:

يَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ مَنْكُوْسًا قرآن کو الٹ کر پڑھتا ہے

بظاہر اس کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ سورتوں کی جو عام ترتیب ہے بجائے اس ترتیب کے الٹ کر قرآن کو پڑھتا ہے، لکھا ہے کہ جواب میں ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ:

ذٰلِكَ مَنْكُوْسُ الْقَلْبِ وہ اوندھے دل کا آدمی ہے

بتائیے کہ اسی زمانے میں جب اس قسم کے لوگوں کو منکوس القلب کہا گیا تھا تو آج سورتوں ہی کی ترتیب میں تصرف و ترمیم کی جرأت کیوں کی جائے؟ ہم بے جا جرأت کے ان مجرموں کو کیا سمجھیں یا کیا کہیں حالانکہ میں نے جیسا کہ عرض کیا سورتوں کی ترتیب کا مسئلہ چنداں دشوار بھی نہیں ہے، خود بخاری میں ہے کہ ایک عراقی ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ ذرا اپنا قرآن مجھے دکھائیے ام المومنین نے فرمایا کہ کس لیے دکھاؤں۔ اس نے کہا کہ آپ کے قرآن کی جو ترتیب ہے یعنی سورتوں کی جو ترتیب ہے اسی ترتیب سے میں بھی اپنے قرآن کی سورتوں کو مرتب کرنا چاہتا ہوں ام المومنین نے اس وقت جواب میں فرمایا کہ

مَا یَضُرُّكَ اَیَّهُ قَرَأْتَ	کسی طرح پڑھو تم کو اس سے نقصان
(بخاری ج ۲ ص ۷۴۷)	نہ پہنچے گا۔

میں نے پہلے بھی کہیں کہا ہے کہ بچوں کے لئے عم کا پارہ سہولت کے لیے آج بھی اس ترتیب پر نہیں چھپتا جس ترتیب پر قرآن میں یہ سورتیں ہیں اور یہ وہی بات ہے کہ ایک ہی مصنف کی چند کتابوں کو آپ جس ترتیب سے چاہیں جلد بندی کرا سکتے ہیں کتاب کے معانی و مطالب پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

پس اصل مسئلہ ہر ہر سورۃ کی آیتوں کی ترتیب کا ہے اس مسئلہ میں جیسا کہ سیوطی نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کا اول سے آخر تک اس پر اتفاق ہے کہ آیتوں کی ترتیب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جبرئیل علیہ السلام کے حکم سے دی ہوئی ہے اس ترتیب میں کسی قسم کی ترمیم خود قرآن کی ترمیم ہے سیوطی کے الفاظ یہ ہیں کہ:

تَرْتِیْبُ الْاٰیٰتِ فِی السُّوَرِ	ہر ہر سورہ میں آیتوں کی ترتیب
بِتَوْقِیْفِهٖ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
وَسَلَّمَ وَاَمْرِهٖ غَیْرُ خِلَافٍ	بتانے سے اور حکم سے دی گئی ہے
فِیْ هٰذَا بَیْنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔	اس میں مسلمانوں کے اندر کسی قسم کا
(اتقان نوع ۱۸)	کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اور میری تو سمجھ میں بھی نہیں آتا کہ ایسی بھی کوئی کتاب کیا کسی مصنف کی ہو سکتی ہے کہ اس کے فقروں کو تو کسی نے بنایا ہو اور ان فقروں کو جوڑ کر عبارت

کسی دوسرے نے بنائی ہو۔

ایسا معلوم ہوتا ہے اور میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ عہدِ صدیقی میں سورتوں کی جلد بندی جس ترتیب سے کردی گئی تھی اس کا پابند دوسروں کو نہیں بنایا گیا تھا بلکہ جیسے کسی مصنف کی چند کتابوں کو جلد بندھوانے والے جس ترتیب کے ساتھ چاہتے ہیں جلد بندھوا دیتے ہیں ابتدا میں اسی قسم کی انفرادی آزادی مسلمانوں کو جو تھی اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے بعض صحابیوں کے قرآن کی ترتیب دوسرے صحابی کے نسخے سے کچھ مختلف بھی ہوتی تھی مثلاً غیر معیاری روایتوں میں ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مصحف میں نون کی سورہ الذاریات کے بعد، القیامہ کی سورہ عم یتساء لون کے بعد۔ النازعات کی سورہ الطلاق کے بعد اور الفجر کی سورۃ التحریم کے بعد۔ اسی طرح اُبی بن کعب صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مصحف میں کہتے ہیں کہ الکہف اور الحجرات کی سورتیں نوٓن کے بعد، تبارکؔ حجراتؔ کے بعد، النازعاتؔ، الواقعہ کے بعد، الم نشرح قل ہو اللہ کے بعد تھی۔

لیکن عہدِ عثمانی میں حضرت ابوبکر صدیق کے زمانہ کے مجلد کرائے ہوئے قرآن کی نقلیں حکومت نے مرکزی صوبوں میں تقسیم کر کے یہ حکم مسلمانوں کو جب دیا کہ سورتوں کی ترتیب میں بھی اسی کی پابندی کی جائے اور اس حکم کے بعد دوسری ترتیب سورتوں میں بھی قانوناً ممنوع قرار دیدی گئی تو اس وقت سے یہ اختلاف بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

باقی یہ سوال کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ حکومت میں جس ترتیب سے سورتوں کی جلد بندی کرائی گئی تھی آیا یہ صحابہ کی رائے سے فیصلہ کیا گیا تھا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے یہ ترتیب سورتوں میں قائم کی گئی، کوئی واضح روایت اس باب میں نہیں ملتی لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ،

إِنَّمَا أُلِّفَ الْقُرْآنُ عَلَىٰ	یعنی اس وقت قرآنی سورتوں میں ترتیب
مَا كَانُوا يَسْمَعُونَ مِنَ	اسی ترتیب کی پیروی میں دی گئی جس ترتیب
النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ	سے صحابہ قرآن کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
وَسَلَّمَ (اتقان ص۶۲)	سے سنتے تھے۔

امام مالکؒ کی اس تاریخی شہادت کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ جس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی جبرئیل علیہ السلام کو اس سے پہلے جو رمضان گزرا تھا، دو دفعہ قرآن آپ نے سنایا تھا۔ یہ روایت بخاری وغیرہ تمام صحاح کی کتابوں میں پائی جاتی ہے اس وقت تک بجز چند آیتوں کے قرآن پورا نازل ہو چکا تھا پس جس ترتیب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل کو سنایا تھا کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ سورتوں کی جلد بندی میں اس طرزِ عمل کی پیروی نہ کی جاتی۔ پس سورتوں کی ترتیب کا مسئلہ بھی اس لحاظ سے جبرئیل امین ہی کا توثیق یافتہ ہے اور خدا کا فضل ہے کہ عہدِ عثمانی کے اس فرمان کے بعد جس میں عہدِ صدیقی کے مرتبہ مصحف کی پیروی ہر مسلمان

کے لیے لازم کردی گئی۔ اس وقت تک مسلمان مشرق و مغرب میں اول سے آخر تک اسی کے پابند ہیں البتہ ضرورتاً جیسے بچوں کی تعلیم وغیرہ کی سہولت کے لیے کبھی اس آزادی سے بھی نفع اُٹھا لیا جاتا ہے جو اس فرمان کے نفاذ سے پیشتر صحابہ میں پائی جاتی تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ گو قرآن کے پڑھنے پڑھانے کے سلسلے میں تجویدی خدمات اور اس کے سمجھنے سمجھانے میں تفسیری کارناموں کے سوا خود قرآن کے لکھنے لکھانے میں بھی مسلمانوں نے جن اولوالعزمیوں کا بھی ثبوت دیا ہو عربی غیر عربی ہر قسم کے مسلمانوں کے لیے قرآن کا پڑھنا آسان ہو جائے اس کے لیے انہوں نے جو کچھ بھی کیا ہو حروف میں غیر معمولی محاسن پیدا کیے گئے اعراب و زیر و زبر پیش جزم تشدید وغیرہ جیسی ایجادیں کی گئیں حتیٰ کہ یہ واقعہ ہے کہ قرآن کو مسلمانوں نے سونے موتی اور مختلف قسم کے جواہر کے سیّال محلول سے بھی بکثرت لکھوایا۔ اور کیا کیا بتاؤں کہ اس تیرہ سو سال کے عرصے میں کیا کچھ نہیں کیا۔[1]

---

[1] حال ہی میں میں نے ایک کتاب میں پڑھا کہ نظام الملک طوسی سلجوقی دربار کے مشہور وزیر کے پاس ہدیہ میں ایک عالم نے جن کا نام عبدالسلام ابو یوسف تھا، قرآن مجید لکھ کر پیش کیا تھا جس میں یہ صنعت (باقی صفحہ ۱۱۱ پر